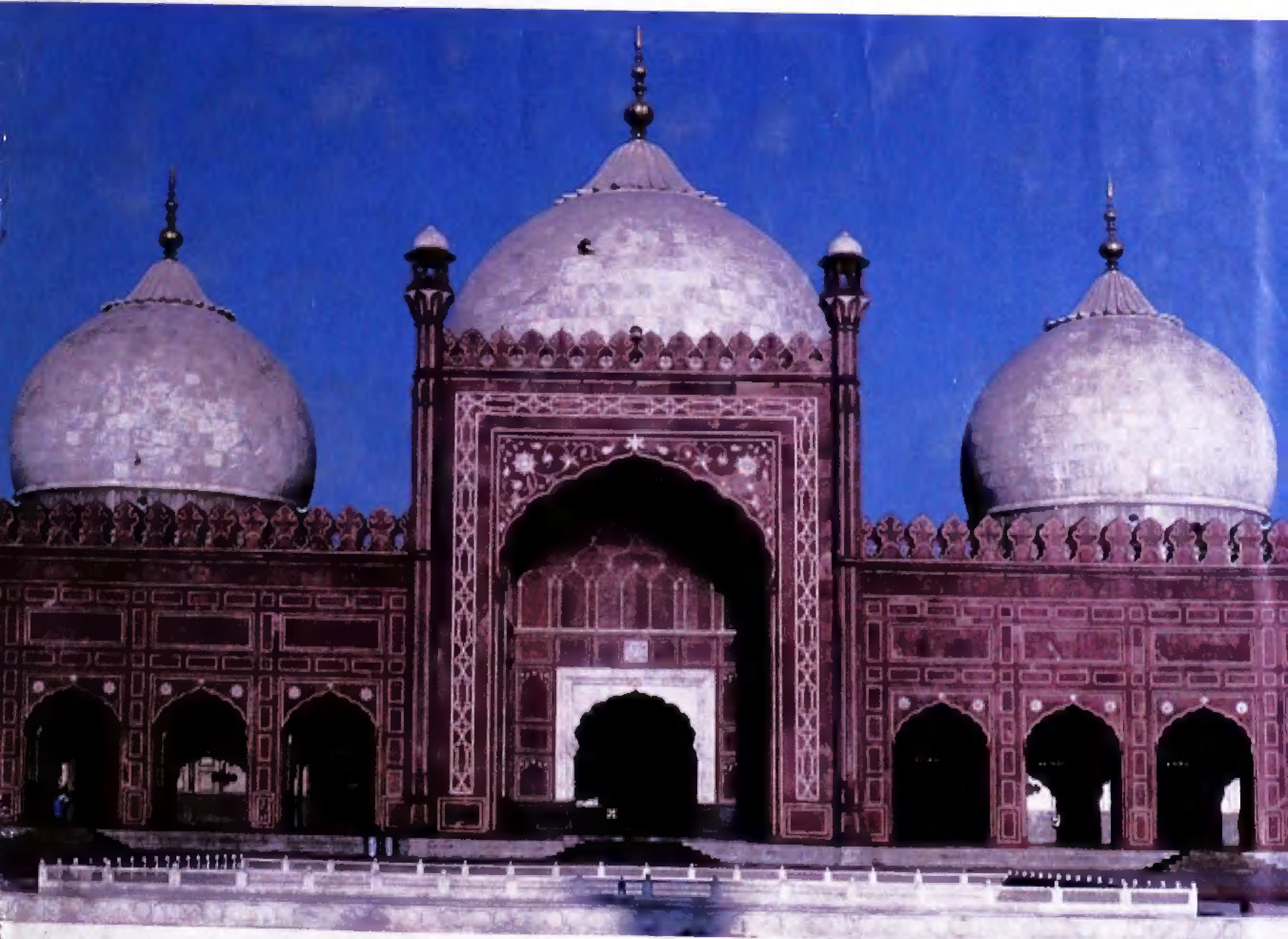
فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین



تالیف

مولانا مجیب اللہ ندوی

مرکزِ تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری

نِسبت روڈ ○ لاہور

سلسلۂ مطبوعات مرکزِ تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری — ۲۷

فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین



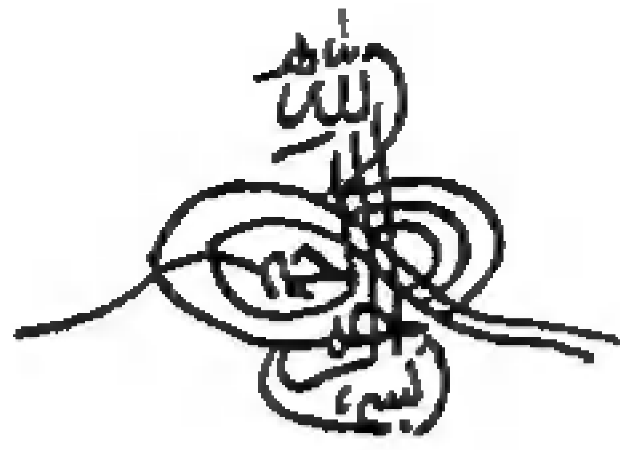
تالیف

مولانا مجیب اللہ ندوی

مرکزِ تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری
نسبت روڈ ○ لاہور

نام کتاب ــــــ فتاوٰی عالمگیری کے مؤلفین
مؤلف ــــــ مولانا مجیب اللہ ندوی
مطبع ــــــ ریڈنگ پرنٹنگ پریس مال روڈ لاہور
باہتمام ــــــ حافظ غلام حسین ریسرچ آفیسر
ناشر ــــــ مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری نسبت روڈ لاہور
تعداد صفحات ــــــ ۱۳۶
قیمت ــــــ ۳۶/۰۰ روپے
ملنے کا پتہ ــــــ مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری نسبت روڈ لاہور

فہرست



تقدیم

شہنشاہ اورنگزیب عالمگیرؒ کا عہد حکومت اسلامی نظام کے نفاذ کے اعتبار سے تمام مغل حکمرانوں کے مقابلے میں ایک مثالی عہد حکومت مانا جاتا ہے۔ وہ خود نہایت دیندار صاحب علم متقی اور پرہیزگار حکمران تھا۔ اور اس نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ برصغیر جنوبی ہند میں اسلام اپنی تمام تر خوبیوں اور جامعیت کے ساتھ برپا ہو، اور اسلام کا پیش کردہ عدل اجتماعی معاشرت، معیشت، سیاست و عدالت میں نافذ ہو۔ خود درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن بغیر کسی تفریق مذہب و ملت کے دن رات ملک کے عوام کی بہبود میں لگا رہتا تھا۔ تاہم جب اس نے اسلام کے عدالتی اور معاشرتی نظام کو مکمل طور پر نافذ کرنے کا ارادہ کیا۔ تو چونکہ ملک کی مسلم اکثریت حنفی مسلک کی پابند تھی اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ فقہ حنفی کے مطابق اس ملک کے تمام نظامات بالخصوص عدالتی نظام کو چلایا جائے لیکن دشواری یہ تھی کہ اسلامی دنیا میں فقہ حنفی کی کوئی ایسی مستند واحد کتاب موجود نہ تھی جس سے ایک عام مسلمان باآسانی کسی مُفتیٰ بہ مسئلہ کو اخذ کر سکے اور شریعت کے احکام سے بخوبی واقف ہو سکے۔ علماء اور فقہاء کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلاف موجود تھا

اور ہر عالم کی رائے دلائل کے ساتھ کتابوں میں موجود تھی۔ جب کسی شخص کو ان مسائل کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا ہوتی تھی تو کسی ایک حتمی رائے پر پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ فقہ کی سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کی جائے۔ نیز یہ کام اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا تھا جبتک کہ کسی شخص کو علم فقہ میں مہارت تامہ حاصل نہ ہو۔ اور بہت سی مبسوط کتابیں اسے میسر نہ ہوں اندازہ لگائیے کہ حکم صحیح اور حق صریح کو معلوم کرنے میں عام اہل علم کو کس قدر دشواریاں پیش آتی ہوں گی۔ ان حالات کے پیش نظر شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر نے فیصلہ کیا کہ ایک ایسی جامع اور مبسوط حنفی فقہ کی کتاب مرتب کرائے جو دیگر کتب فقہ سے بے نیاز کر دے اور فقہ کی تمام جزئیات کو محیط ہو نیز ہر حکم مفتی بہ ہو۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے عالمگیر نے دہلی کے علاوہ سلطنت مغلیہ کے اطراف واکناف سے ایسے علماء جمع کیے جنہیں علم فقہ میں مہارت تامہ حاصل تھی اور انہیں حکم دیا کہ مختلف کتابوں کی مدد سے ایک ایسی جامع اور مستند کتاب تیار کریں جس میں نہایت تحقیق کے ساتھ تمام مسائل جمع کیے جائیں تاکہ حکام اور علمائے احناف دیگر حنفی کتب فقہ سے مستغنی ہو جائیں۔ علماء کی اس جماعت کی صدارت کے منصب پر شیخ نظام الدین برہان پوری کو مقرر کیا گیا اور کام کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے ایک ایک حصے کی تدوین و ترتیب کا ایک ایک عالم کو ذمہ دار بنا دیا گیا۔ اور ہر عالم کی مدد کے لیے دس دس علماء مقرر کیے گئے۔ بادشاہ رات میں فرصت کے اوقات میں خود مسودات پڑھوا کر سنتا اور جہاں ضروری سمجھتا تنقید کرتا اور مشورہ دیتا۔ اس طرح فتاوی عالمگیری کی تدوین عمل میں آئی۔ عالمگیری سکے کے دو لاکھ روپے علماء کے وظائف پر خرچ کیے گئے اور تقریباً سات آٹھ سال کی مدت میں یہ کام مکمل ہوا۔ یعنی ۱۶۷۴ء اور ۱۶۷۵ء کے لگ بھگ یہ کام شروع ہو کر ۱۶۸۲ء کے قریب اختتام کو پہنچا۔ اس کام کی انجام دہی میں

تقریباً پچاس علماء شریک ہوئے۔ اور کتب خانۂ شاہی سے ایک سو تیس کتابیں حوالے کے لیے لی گئیں۔ چونکہ یہ کام شہنشاہ اورنگزیب عالمگیرؒ نے انجام دلوایا تھا اس لیے اس کا نام فتاویٰ عالمگیری رکھا گیا اور چونکہ اس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ تھا اس لیے اس کتاب کو ساری دنیا میں قبول عام حاصل ہوا اور فقہ حنفی میں ہدایہ کے بعد اس کا درجہ مانا گیا ہے اور آج بھی فقہ حنفی کی اس سے زیادہ واضح، مفصل اور مبسوط کتاب دنیا میں موجود نہیں۔

فتاویٰ عالمگیری کے مسودے کی ترتیب میں انتہائی احتیاط سے کام لیا گیا اور پھر اس پر نظر ثانی بھی کی گئی اور خامیوں اور فروگذاشتوں کو دور کیا گیا۔ ان احتیاطوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتاب خامیوں اور غلطیوں سے کافی حد تک پاک ہے۔ صاحب مرأۃ العالم کا بیان ہے کہ فتاویٰ عالمگیری کا فارسی میں بھی ترجمہ ہوا ہے اور یہ کام چلپی عبداللہ رومی نے انجام دیا مگر ان کا ترجمہ اب ناپید ہے۔ اس کا اردو ترجمہ سید امیر علی نے کیا ہے جو دس جلدوں میں مطبع نولکشور لکھنو فتاویٰ ہندیہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ۱۸۵۰ء میں اس کے منتخبات کا انگریزی ترجمہ "بیلی" نے

ADIGEST OF MOHAMMATAN
HANEEFEA AND ISLAMIA LAW IN INDIA

کے نام سے شائع کیا (اردو دائرہ معارف اسلامیہ)

برصغیر جنوبی ایشیا میں عرصۂ دراز تک فتاویٰ عالمگیری کے مطابق مسلم عدالتوں کے فیصلے ہوتے رہے۔ برطانوی دور حکومت میں بھی محمڈن لاء کے سلسلے میں اس کتاب کو درجہ استناد حاصل تھا اتنے عظیم کارنامے کی انجام دہی میں جن علماء نے حصہ لے کر اتنے بڑے صدقہ جاریہ کا اہتمام کیا انہیں جاننا اور انہیں یاد رکھنا ملت کا مقدس فریضہ ہے کیونکہ جو قومیں اپنے محسنوں کو فراموش کر دیتی ہیں ماضی

سے انکا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور وہ جمود وخمول کا شکار ہو جاتی ہیں اسی مقصد کے تحت برصغیر جنوبی ایشیاء کے معروف صاحب قلم حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی نے بہت عرصہ پہلے علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے چند حواشی کی تحریک پر "فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین" کے حالات وسوانح جمع کر کے "معارف" میں شائع کرنا شروع کیا اور حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نیز اس وقت کے دیگر اکابر نے ان کے اس علمی کام کو بے حد پسند کیا تھا اتنا وقیع علمی کام ۱۹۴۴ء سے "معارف" کے پرچوں میں منتشر پڑا ہوا تھا الحمد للہ کہ حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی نے مرکز تحقیق (ریسرچ سیل) دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کو یہ سعادت بخشی ہے کہ وہ مولانا موصوف کے اس عظیم علمی و تحقیقی کارنامہ کو کتابی شکل میں پیش کر رہا ہے اس علمی تعاون اور مہربانی کے لیے ہم مولانا مجیب اللہ ندوی کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو صحت، وسلامتی کے ساتھ حیات دراز عطا فرمائے تاکہ مرکز تحقیق کے ساتھ ان کا یہ تعاون عرصہ دراز تک جاری رہے۔ آمین

مورخہ ۳ر جنوری ۱۹۸۸ء

سید محمد اکرم سلیم (دستخط)

ڈائریکٹر ریسرچ سیل دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور

دیباچہ

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کے مطابق راقم الحروف ۱۴؍ نومبر ۱۹۴۴ء کو ندوہ سے فراغت کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی دار المصنفین آگیا، دار المصنفین آتے ہی حضرت سید صاحب نے فرمایا کہ پہلے علم بالفہرست حاصل کرو، ان کا مقصد یہ تھا کہ کتب خانہ کی ہر فن کی کتابوں پر پہلے ایک نگاہ ڈال لو تاکہ حوالہ وغیرہ تلاش کرنے میں آسانی ہو، چنانچہ اس حکم کے مطابق صبح کو کسی فن کی الماری کے پاس بیٹھ جاتا اور دن بھر کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہتا تھا، کسی کتاب اور مصنف کا نام دیکھ لیتا اور ورق گردانی کر کے رکھ دیتا اور کچھ کتابوں کے دو چار صفحے اور کچھ کے زیادہ حصے پڑھ ڈالتا، جب رجال وطبقات کی کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگا تو اہل کتاب صحابہ کے سلسلہ میں اپنی پرانی خلش کے دور کرنے کا کچھ مواد ملنا شروع ہو گیا، اور اس پر کچھ لکھنا بھی شروع کر دیا۔

عموماً عربی کی کتابوں کی ورق گردانی اور مطالعہ سے طبیعت گھبرا جاتی تو پھر مزہ بدلنے کے لیے اردو فارسی تذکرے اور فارسی تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دیتا، اس اثنا میں کئی فارسی تاریخ وتذکرہ کی کتابوں کے شروع میں سید صاحب کے قلم سے "مؤلفین فتاویٰ عالمگیری" باریک قلم سے لکھا ہوا ملا، سید صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی کتاب کا مطالعہ کرتے تھے تو کتاب کے شروع میں

جلد سازی میں سادہ ورق لگے رہتے تھے اس پر اپنی یادداشت مع صفحہ لکھ دیا کرتے تھے، سید صاحب کے انہیں حاشیوں سے اس موضوع پر لکھنے کا خیال پیدا ہوا، پھر میں دوسرے کام چھوڑ کر اسی موضوع کی تیاری میں لگ گیا، اور اس کے لیے نہ صرف تاریخ و تذکرہ کی کتابوں کی ورق گردانی کی بلکہ خود فتاویٰ عالمگیری کے ماخذ کی فہرست تیار کرنے کے لیے پوری کتاب کے ایک ایک صفحہ پر نظر ڈالی، اور تین چار مہینے کی محنت کے بعد جو کچھ مواد مل سکا وہ دو قسطوں میں معارف اکتوبر و نومبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا، پھر اس کے بعد کئی اہلِ قلم نے کچھ اور مولفین کی نشاندہی کی اور راقم الحروف بھی اس میں وقفہ وقفہ سے اضافہ کرتا رہا، یہ ایک ایسا موضوع تھا کہ جس پر اس سے پہلے کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا، اور بحمداللہ اچھا خاصا مواد بھی اکٹھا ہو گیا تھا، اس لیے بہت دنوں سے خواہش تھی کہ یہ مضمون بھی کتابی شکل میں شائع ہو جاتا تو شاید اہل علم کو زیادہ سے زیادہ اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا، اور ہندوستان کے علماء کے اس عظیم کارنامے سے واقفیت ہو جاتی، ہم مولانا محمد متین ہاشمی صاحب کے بے حد ممنون ہیں کہ ان کے ذریعہ میری اس طرح کی بہت سی علمی کاوشیں جو گوشۂ گمنامی کی نذر ہو رہی تھیں منصۂ شہود پر آ رہی ہیں۔

اس موضوع کا ایک اہم کام یہ تھا کہ کوئی اسکالر پوری کتاب کا مطالعہ کر کے اس بات کی نشاندہی کرتا کہ اس کی تالیف میں اس وقت کے ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے کچھ مسائل پر علماء نے کوئی رائے دینے کی کوشش کی ہے یا نہیں؟ اس پر کچھ ہندوستانی اثرات پڑے ہیں یا نہیں؟ مثلاً ہندوؤں کو انہوں نے اہل کتاب قرار دے کر ہندو عورتوں کی شادی مسلمانوں سے جائز قرار دیا ہے یا نہیں؟ اسی طرح معاملات کی بعض صورتیں ایسی ہیں جس میں ہندوستانی مزاج کا کس حد تک شریعت کے دائرہ میں لحاظ کیا گیا ہے؟

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے اس مضمون کا خیال حضرت سید صاحبؒ کے حواشی سے پیدا ہوا تھا، جس وقت اس مضمون کی پہلی قسط شائع ہوئی اس وقت حضرت سید صاحبؒ بھوپال میں تھے، انہوں نے اسے دیکھ کر لکھا کہ "عزیزم تم نے فتاوی عالمگیری پر مضمون لکھنا شروع کیا ہے، میرے پیشِ نظر بھی یہ موضوع تھا، مگر وہ پورا نہ ہو سکا، خوشی ہوئی کہ تمہارے ذریعہ یہ کام پورا ہو رہا ہے، جو کچھ لکھو پوری تحقیق اور احتیاط سے لکھو"۔

معارف میں یہ میرا پہلا مضمون تھا جو شائع ہوا تھا، اس لیے حضرت سید صاحبؒ کے علاوہ بعض دوسرے بزرگوں نے بھی ہمت افزائی کے خطوط لکھے، مثلاً مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم نے اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی وغیرہ نے ملاقات کے وقت فرمایا تھا کہ مضمون پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ مجیب اللہ کا مضمون ہے، اگر اس کتاب میں اس وقت کے معاشرہ کے پس منظر وغیرہ کی تفصیل کر دی جائے جیسا کہ آجکل ہوتا ہے اور ان پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈال دی جائے جس کا میں نے ذکر کیا ہے تو یہ مضمون پی. ایچ. ڈی کا مقالہ بن سکتا ہے اور سنا ہے کہ کسی صاحب نے ایسا کیا بھی ہے۔

خدا کرے یہ کتاب مفید ہو اور عالمگیرؒ کے علمی و دینی ذوق اور ہندوستانی علماء کے اس کارنامے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

۱۳/ شعبان ۱۴۰۷ھ

۱۲/ ۴/ ۸۷ء

خادم

مجیب اللہ ندوی

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

فتاویٰ عالمگیری اور اس کے مؤلفین

عرب جہاں بھی گئے، اپنے ساتھ اسلامی علوم وفنون اور تہذیب و معاشرت بھی لے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ایشیا، یورپ اور افریقہ میں جس سرزمین میں انہوں نے قدم رکھا، وہاں کے مذہب کے ساتھ ساتھ تہذیب، معاشرت اور زبان کو بھی بدل دیا۔ اس کے برخلاف ترک و تاتار اور دوسری عجمی مسلمان قومیں جہاں گئیں ان کا مذہب تو اسلام رہا، لیکن تمدن انہوں نے اپنا پھیلایا، یا مقامی معاشرہ سے متاثر ہوئے۔ اسی لیے شام، مصر اور شمالی افریقہ کے مقابلہ میں ہندوستان میں عجمی تمدن اور عجمی مذاق کو زیادہ فروغ ہوا۔

ہندوستان میں اگرچہ صدیوں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی، لیکن اس کے تمام حکمران خانوادے اور ان کے بیشتر عمال حکومت عجمی تھے۔ اس لیے ان کے اثر سے یہاں زیادہ تر عقلی و عجمی علوم کا چرچا رہا، اور ان کے مقابلہ میں خالص دینی علوم تفسیر و حدیث و رجال و طبقات کی خدمت و اشاعت کم ہوئی، تاہم ہر زمانے کے اکابر علماء اپنے طور پر اس فرض کو انجام دیتے رہے، اور دینی علوم کی خدمت میں دوسرے اسلامی ممالک سے ہندوستان کا قدم پیچھے نہیں رہا، حکومت کے بیشتر قوانین بھی اسلامی تھے، خصوصاً مسلمانوں کی روزانہ زندگی کے معاملات و معاشرتی مسائل کا تعلق فقہ سے تھا۔ اسلئے ہر دور میں فقہ کی جانب خاص توجہ رہی، اور فقہ کی

کتابوں پر شروح و حواشی لکھے گئے، اور مطولات کے مختصرات کئے گئے، فقہ و فتاویٰ کی متعدد اہم کتابیں فتاویٰ تاتار خانیہ[1]، فتاویٰ حمادیہ[2] اور فتاویٰ ابراہیمیہ[3] تالیف ہوئیں۔ اورنگ زیب علیہ الرحمۃ نے فتاویٰ عالمگیری[4] مدون کرائی جو ہندوستان کا قابلِ فخر کارنامہ اور گذشتہ فتاوے کی کتابوں میں سب سے زیادہ جامع اور ممتاز ہے۔ اوّل الذکر فتاویٰ افراد کی تالیف تھے۔ اور فتاوی عالمگیری گیارہویں صدی ہجری کے پورے ہندوستان کے منتخب علماء کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے اس میں جو جامعیت اور جزئیات کا جس قدر استقصاء ہے، وہ دوسرے فتاویٰ میں نہیں ہے۔ اور اس کو گذشتہ فتادی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اب تک نہ فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین کے حالات یکجا جمع کئے گئے۔ اور نہ اس کی خصوصیات اور مآخذ پر کچھ لکھا گیا۔ اس کتاب میں اسی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ فتاویٰ عالمگیری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی تالیف نہیں، بلکہ علماء کی ایک ممتاز جماعت کی تالیف ہے۔ اس لیے وہ ان نقائص اور فروگذاشتوں سے پاک ہے، جس کا ایک فرد واحد کی تالیف میں امکان رہتا ہے۔

---

[1] مؤلفہ عالم بن العلاء متوفی ۷۸۲ھ [2] مؤلفہ ابوالفتح رکن بن حسام ناگوری [3] مؤلفہ قاضی نظام الدین متوفی ۸۷۹ھ [4] اول الذکر کتابیں غالباً ان کے مصنفین کے انفرادی فتووں کا مجموعہ یا ان کی تصانیف تھیں مگر فتاویٰ عالمگیری یا فتاویٰ ہندیہ تو ایک اکیڈمک تصنیف ہے اس لیے اس کا نام فتاویٰ دینے کی بجائے کوئی اور نام دینا چاہیئے تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر فقہ کی مستقل تصانیف کے لیے بھی فتاویٰ کا لفظ ہندوستان میں متداول ہو گیا تھا۔

۲۔ اس میں وہی مسائل لیے گئے، جو راجح مفتیٰ بہ یا ظاہر الروایت[1] کے ہیں، اگر کوئی مسئلہ ظاہر الروایت میں نہیں ہے، تو نوادرات سے لے لیا گیا ہے، لیکن اس تصریح کے ساتھ کہ کتاب میں اس پر فتویٰ کا اشارہ موجود ہے۔

۳۔ ہر مسئلہ کے ساتھ اس کے مآخذ کا مفصل حوالہ بھی دے دیا ہے، جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے، اگر اس میں کسی دوسری کتاب سے نقل کیا گیا ہے تو ناقلاً عن فلاں کرکے اصل ماخذ کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔

۴۔ اگر کسی مسئلہ کے بارے میں دو مختلف اقوال ہیں اور دونوں میں سے کوئی قابل ترجیح نہیں ہے، تو دونوں کو مع حوالہ نقل کر دیا گیا ہے۔ اگر کسی کتاب کی لفظ بلفظ نقل ہے تو کذا لکھدیا ہے اور اگر اس کا خلاصہ اور مفہوم لے لیا ہے، تو ہکذا سے اشارہ کر دیا گیا ہے۔

۵۔ یہ کتاب تقریباً آٹھ برس میں تیار ہوئی، اور کم و بیش دو لاکھ روپے اس پر صرف ہوئے۔

عالمگیری کے مآخذ

فتاویٰ عالمگیری فقہ کی تمام اہم اور معتبر کتابوں کا خلاصہ اور عطر ہے۔ ذیل میں عالمگیری کے تمام مآخذ کی فہرست دی جاتی ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ علماء نے کس جاں کاہی سے سینکڑوں خرمنوں سے خوشہ چینی کرکے فقہ و فتاویٰ کا یہ ذخیرہ جمع کیا ہے۔

۱۔ ہدایہ ص ۳ برہان الدین المرغینانی (۲) شرح طحاوی ص ۳ غالباً امام بدر الدین العینی کی شرح مراد ہے (۳) ذخیرۃ العقبیٰ ص ۳ شرح منیۃ المصلی (۴) مضمرات ص ۳ قدوری کی شرح اس کا دوسرا نام جامع المضمرات ہے (۵) البدائع ص ۳ (۶) المغنی ص ۳ (۷) عینی شرح ہدایہ ص ۴ (۸) الخلاصہ ص ۴ (۹) فرائض الزاہدی ص ۴ ابو الرجا مختار بن محمود م ۶۵۸ھ (۱۰) ظہیریہ ص ۴ ظہیر الدین البخاری ۶۱۹ھ (۱۱) محیط ص ۴، اس نام کی دو کتابیں

[1] چھ کتابیں ظاہر الروایت میں شمار کی جاتی ہیں ۱۔ جامع کبیر ۲۔ جامع صغیر ۳۔ مبسوط ۴۔ زیادات ۵۔ السیر الکبیر ۶۔ السیر الصغیر

ہیں ، ایک برہان الدین صدر الشریعہ کی تصنیف ہے۔ جو المحیط البرہانی کے نام سے موسوم ہے ، دوسری رضی الدین السرخسی کی جو محیط السرخسی کے نام سے مشہور ہے۔ ثانی الذکر کے بعض نسخے مصر وغیرہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں غالباً عالمگیر کے شاہی کتب خانہ میں بھی اس کا کوئی نسخہ موجود تھا ، الفوائد البہیہ میں مولانا عبدالحئی نے لکھا ہے کہ اس کے بعض نسخے میری نظر سے گذرے ہیں (۱۲) طحاوی (۱۳) فتاوی قاضی خاں ص ۴ (۱۴) شرح وقایہ ص ۴ (۱۵) التبیین ص ۴، امام نسفی (۱۶) محیطین ص ۴ شاید اس سے مراد محیط برہانی اور محیط السرخسی ہو (۱۷) السراج الوہاج ص ۴ (۱۸) فتح القدیر ص ۴، لابن ہمام (۱۹) البحر الرائق ص ۴ (۲۰) الجامع الصغیر ص ۴ ، امام محمد (۲۱) الجامع الوجیز ص ۴ للکردری ۸۱۲ھ کی تصنیف ہے (۲۲) یتیمیہ ص ۴ (۲۳) تاتار خانیہ ص ۴ عالم بن العلاء (۲۴) فتاوی سراجیہ ص ۴، الاوشی الفرغانی ۵۶۹ھ میں لکھی گئی (۲۵) اختیار فی شرح المختار ص ۴ (۲۶) کفایہ شرح ہدایہ ص ۴ جلال الدین الخوارزمی (۲۷) فتاوی برہانیہ ص ۴ (۲۸) الجوہرۃ النیرہ ص ۴ قدوری کی پہلی شرح ابوبکر الحدادی العبادی متوفی ۸۰۰ھ (۲۹) قنیۃ المنیہ ص ۴ نجم الدین الزاہدی القزینی م ۶۵۸ھ (۳۰) محیط السرخسی ص ۴ (۳۱) النہر الفائق ص ۷ (۳۲) مبسوط ص ۷، السرخسی (۳۳) فتاوی الحجہ ص ۷ (۳۴) النہایہ ص ۷ (۳۵) تحفہ ص ۸ (۳۶) الصباح ص ۸ (۳۷) الوافی ص ۸ (۳۸) خزانۃ الفقہ ص ۹ ، امام ابواللیث م ۳۸۳ھ (۴۰) الملتقط ص ۱۱ (۴۱) شرح المنیہ للجمی ص ۱۱ (۴۲) الزاد ص ۱۳ (۴۳) فتاوی غیاثیہ ص ۱۴ (۴۴) شمنی ص ۱۴ تقی الدین الشمنی م ۸۷۲ھ (۴۵) فتاوی شیخ الاسلام ص ۱۵ المعروف بخواہر زادہ ص ۸۴ (۴۶) شرح المبسوط ص ۱۶ (۴۷) عنایہ ص ۱۷ (۴۸) منیۃ المصلی ص ۱۷ (۴۹) خزانۃ المفتیین امام حسین بن محمد السمنقانی ۷۴۰ھ کی تصنیف ہے (۵۰) عینی شرح کنز ص ۲۲ (۵۱) المفید والمزید (۵۲) شرح منیہ ص ۲۲ لابن امیر الحاج (۵۳) کنز الدقائق ص ۲۴ (۵۴) خزانۃ الفتاوی ص ۲۷ احمد بن محمد الحنفی صاحب مجمع الفتاوی

(۵۵) الاسرار فی الاصول والفروع ص ۲۸ ابوزید عبید اللہ بن عمر الدبوسی م ۴۳۰ھ
(۵۶) شرح الزیادات ص ۲۹ (۵۷) شرح النقایہ ص ۳۵ شیخ المکارم (۵۸) الصغیری ص ۳۵
(۵۹) شرح المجمع ص ۳۶ لابن الملک (۶۰) تجنیس ص ۳۶ صاحب ہدایہ (۶۱) نصاب ص ۴۲
(۶۲) الکبریٰ ص ۴۲ (۶۳) تنویر ص ۴۲ شرح تلخیص جامع الصغیر (۶۴) عنایہ ص ۴۴ شرح
ہدایہ (۶۵) فتاوی الغرائب ص ۴۴ (۶۶) محیط السرخسی ص ۴۵ (۶۷) فتاوی عتابیہ
ص ۴۷ ابونصر عتابی م ۵۸۶ھ (۶۸) فتاوی قراخانی نافلاً عن الواقعات الحسامیہ ص ۴۷
(۶۹) صیرفیہ ص ۴۸ دوسرا نام فتاوی آہو ہے (۷۰) مختار الفتاوی ص ۵۱ لابی الفضل
مجد الدین الموصلی م ۶۸۳ھ (۷۱) قدوری ص ۵۱ (۷۲) شرح منیہ نافلاً عن الحاوی ص ۵۱
(۷۳) فتاوی التمرتاشی ص ۵۴ ابومحمد ظہیر الدین الحنفی م ۶۰۰ھ (۷۴) ینابیع ص ۵۶
اسفرائینی کی ینابیع الاحکام مراد ہے، یا شرح القدوری (۷۵) شایان شرح الہدایہ
ص ۵۶ (۷۶) الفتاوی العتابیہ المعروف بجامع الفتاوی ص ۵۷ (۷۷) شرح مقدمہ
ابی اللیث متوفی ۳۸۳ھ (۷۸) مصفی ص ۶۹ (۷۹) وقایہ ص ۷۲ (۸۰) النقایہ ص ۷۲
(۸۱) تہذیب ص ۸۷ شیخ احمد النقلائشی (۸۲) خانیہ ص [illegible]۸ (۸۳) جامع الجوامع ص ۸۵
(۸۴) جواہر الاخلاطی ص ۹۱ (۸۵) الحصیری ص ۹۳ (۸۶) البرجندی ص ۱۰۲ (۸۷) غایۃ البیان
ص ۱۰۶ شرح ہدایہ (۸۸) مختارات النوازل لصاحب الہدایہ (۸۹) برجندی ص ۱۰۸
(۹۰) اقرار العیون ص ۱۱۰ (۹۱) نفقات ص ۵۷۴ (۹۲) فتاوی الواجیہ ص ۵۶۹ فتاوی
کی کتاب ظہیر الدین ابوبکر الحنفی متوفی ۶۰۰ھ کی تصنیف ہے (۹۳) شرح نقایہ برجندی
ص ۵۶۹ (۹۴) الغایہ للسروجی، ہدایہ کی شرح ابوالعباس احمد بن ابراہیم السروجی کی
تصنیف ہے م ۷۱۰ھ (۹۵) المنتقی ص ۵۶۷ (۹۶) فتاوی الکبری ص ۵۴۷ حسام الدین
عمر بن عبد العزیز م ۵۳۶ھ (۹۷) فتاوی الصغری ص ۵۴۷ حسام الدین عمر بن عبد العزیز م ۵۳۶ھ
(۹۸) الواقعات ص ۵۲۴ (۹۹) المجتبی (۱۰۰) التحریر شرح جامع الکبیر للحصیری جمال الدین محمود

بن احمد البخاری المعروف بالحصیری م ۶۳۶ھ نے دو شرحیں لکھی ہیں، ایک مفصل اور ایک مختصر، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ حوالہ کس شرح کا ہے (۱۰۱) فتاوی امام کرخی ص ۵۶ امام کرخی مشہور فقیہہ ہیں (۱۰۲) الیقالی (۱۰۳) شرح تلخیص جامع الکبیر (۱۰۴) ملخص المحیط (۱۰۵) الفصول العمادیہ، جمال الدین بن عماد الدین الحنفی (۱۰۶) الحاوی القدسی قاضی جمال الدین احمد بن محمد المتوفی ۵۹۳ھ یا ۶۰۰ھ (۱۰۷) شرح کتاب الاستحسان شمسی کی شرح شمس الائمہ حلوائی نے کی ہے۔ یہ وہی شرح ہے (۱۰۸) شرح الزیادات للعتابی، امام ابوالقاسم احمد بن محمد العتابی متوفی ۵۸۶ھ کی تصنیف ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر بے نظیر ہے (۱۰۹) کتاب زرین (۱۱۰) البحر الزاخر، سراج الوہاج جو مختصر القدوری کی شرح ہے، یہ کتاب اسی کا خلاصہ ہے (۱۱۱) فصول الاسترو شنی امام مجد الدین ابوالفتح متوفی ۶۳۲ھ کی تالیف ہے (۱۱۲) فتاوی فضلی ابو عمر عثمان الفضلی متوفی ۵۱۸ھ (۱۱۳) فوائد العلامہ شیخ الاسلام برہان الدین (۱۱۴) فوائد نظام الدین، (۱۱۵) فتاوی نسفی، نسفی مشہور فقیہہ ہیں (۱۱۶) فتاوی الخجندی، اپنے وقت کے تمام مشائخ کے فتاوی کو جمع کر دیا ہے (۱۱۷) نوادر ابن سماعہ (۱۱۸) الواقعات الساميہ (۱۱۹) الاسعاف برہان الدین ابراہیم بن ابی بکر الطرابلسی م ۹۲۲ھ نے اس میں اوقاف کے تمام مسائل اور جزئیات جمع کر دئیے ہیں (۱۲۰) فتاوی رشید الدین (۱۲۱) شرح ادب القاضی، غالباً صدر الشہید کی شرح مراد ہے (۱۲۲) فتاوی آہو جس کا دوسرا نام فتاوی صیرفیہ بھی ہے (۱۲۳) المستصفی شرح النافع (۱۲۴) فتاوی ابی الفتح، غالباً مجد الدین ابوالفتح م ۶۳۲ھ کے فتاوے مراد ہیں۔

ماخذ کی فہرست سرسری مطالعہ سے تیار کی گئی ہے، مزید تلاش و تفحص سے ممکن ہے کچھ اور نام بھی نکل آئیں تاہم اس سے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا کہ فتاوی کی تالیف میں کس قدر اہتمام تلاش و جستجو اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اور

فقہ حنفی کی کوئی متداول اور قابل ذکر کتاب ایسی نہیں ہے جس سے اس کی تالیف میں فائدہ نہ اٹھایا گیا ہو۔

فتاوی عالمگیری کا سنہ تصنیف

فتاوی عالمگیری کے سنہ تصنیف کا یقینی تعین کرنا تو بہت مشکل ہے، لیکن ذیل کے بیانوں سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ عالمگیر نامہ کا مصنف عالمگیر کی حکومت کے گیارہویں سال کے واقعات میں لکھتا ہے:۔

چون ہمگی ہمت والا نہمت شریف برائے آن خدیو دین پرور حق پژدہ مصروف است باآنکہ کافہ مسلمین در احکام دین متین بمسائلے کہ اکابر علماء و ائمہ مذہب شریف حنفی بدان فتوی دادہ معمول بہا معمول علیہا دانستہ عمل نماید... معہذا مجموع آں را یک کتاب حاوی نیست...... لاجرم بر ضمیر مہر انوار در امور دین و دولت بفتوی الہام کار گذار است پرتو ایں عزیمت تافت کہ جمعے از علمائے سریر اعلیٰ کتب معتبرہ نسخ مبسوط آں فن را کہ در کتاب خانہ خاصہ شریفہ[1] بروزگاراں از اطراف و اکناف عالم فراہم آمدہ جلوہ گار انظار تتبع ساختہ از روی تحقیق و تدقیق وخوض و غور انیق بجمع تالیف آں مسائل پردازند و از مجموع آں نسخۂ جامعہ مرتب سازند تا ہم گناں را استکشاف مسئلہ مفتی بہادر ہر باب بمراجعت آں کتاب بسہولت و آسانی دست دہد... چوں آں کتاب مستطاب اتمام گیرد و پیرایۂ اختتام پذیر وجہانیاں

---

[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر کا ذاتی کتب خانہ تھا، جو بڑی کوشش سے جمع کیا گیا تھا، جس میں فقہ کی تمام متداول کتابیں موجود تھیں۔

را از سائر کتب فقہی مستغنی خواہد بود۔[1]

دس لاکھ روپے اور ایک لاکھ مسائل

مرأۃ العالم میں ہے کہ اس کی تصنیف پر دہ لاکھ روپے صرف ہوئے اس کی عبارت ملاحظہ ہو۔

چنانچہ قریب دہ لکھ روپیہ صرف لوازم ایں کتاب مستطاب کہ زیادہ از یک لکھ بیت باشد شدہ، انشاء اللہ ہر گاہ آرائش تمام دپیرا یہائے اختتام یابد جہانیاں را از سائر (کتب) فقہی مستغنی خواہد بود۔[2]

ان بیانات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۷۸ھ میں جو عالمگیر کی حکومت کا گیارہواں سال ہے، یا اس سے کچھ پہلے فتاوی کا کام شروع ہو چکا تھا، مگر

چوں آں کتاب صورت اتمام گیرد و پیرایۂ اختتام پذیرد سے

یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔

اگر ۱۰۷۷ھ یا ۱۰۷۸ھ کو اس کی تالیف کا زمانہ قرار دے کر اسی کے ساتھ اس مشہور روایت[3] کو بھی ملا دیا جائے، کہ اس کی تالیف میں آٹھ برس کی مدت صرف ہوئی تو اس کی تکمیل کا زمانہ ۱۰۸۵ھ یا ۱۰۸۶ھ قرار پائے گا۔

فتاوی کا فارسی ترجمہ

کتاب عربی میں لکھی گئی تھی، اس لیے عام لوگ اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے تھے، ان کی آسانی کے لیے اورنگ زیب نے چلپی عبد اللہ اور ان کے شاگردوں کو اس کے فارسی ترجمہ کے لیے مامور کیا، مرأۃ العالم میں ہے۔

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۷ [2] قلمی نسخہ دار المصنفین، یہ کتاب بھی عالمگیر کی حکومت کے ابتدائی دس گیارہ سال کے واقعات پر مشتمل ہے [3] معارف نمبر ۵ جلد نمبر ۳۹ مضمون "عالمگیر کا علمی ذوق" سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب علیگ۔

برائے سہولت ہم گناں... چلپی عبداللہ.... باچند تلامذہ بترجم نوشتن بفارسی مامور (ص ۲۷۵ قلمی نسخہ)

تبصرۃ الناظرین میں:

چلپی عبداللہ بترجمۂ آں (عالمگیری) مامور بود (ص؟ قلمی نسخہ)

فتاویٰ عالمگیری کا مترجم کون تھا؟

اوپر مراۃ العالم اور تبصرۃ الناظرین کے بیانات نقل کیے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فتویٰ عالمگیری کے مترجم چلپی عبداللہ تھے مگر مراۃ العالم کے مصنّف بختاور خاں نے چلپی عبداللہ کے نام کے ساتھ اتنا اور اضافہ کر دیا ہے کہ چلپی عبداللہ خلف ارشد قدوۂ فضلائے نامدار مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی باچند تلامذہ بترجم نوشتن این کتاب بفارسی مامور ہست۔ (مراۃ العالم ص۲۷۵)

آگے اس کی پوری تفصیل آئے گی کہ اس کے مترجم عبداللہ سیالکوٹی نہیں بلکہ چلپی عبداللہ ہیں جو ترکی النسل تھے۔ خود مراۃ العالم کے دوسرے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے۔

مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ ترجمہ پورا بھی ہوا کہ نہیں اور نہ اس کے وجود کا کوئی سراغ لگ سکا۔

فتاویٰ کی تالیف کا طریقہ

فتاویٰ عالمگیری کے جمع و ترتیب کا طریقہ یہ تھا کہ فقہی ابواب کے لحاظ سے اس کو کئی حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، اور ہر حصہ کے لیے ایک الگ صدر اور صدر کے لیے چند معاونین کی ایک جماعت مقرر تھی۔ ہر صدر اپنے اپنے حصہ کا ذمہ دار تھا، اخذ و استنباط میں اگر کوئی غلطی ہو جاتی تھی، تو ملا نظام جو اس مجلس کے صدر اعلیٰ تھے۔ اس شعبہ کے صدر سے باز پرس کرتے تھے، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ ذیل میں ان لوگوں

کے نام درج کئے جاتے ہیں جن پر ان کے کسی حصہ کی تکمیل کی ذمہ داری تھی۔

۱۔ حصہ اول کے جمع و ترتیب کا کام شیخ جلال الدین محمد جونپوری کے سپرد تھا، مشاہیر جونپور میں ہے:

"از تصنیفات و تالیفاتش فتاویٰ عالمگیری حصہ اوّل است کہ حسب الامر سلطانی جمع نمودہ" (ص ۱۲۲)

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کتنے علماء معاون کی حیثیت سے ان کے شریک کار تھے۔

۲۔ ایک حصہ کی تکمیل شیخ وجیہ الدین گوپاموی کے سپرد تھی، اور ان کی امداد و اعانت کے لیے دس عالم اور مقرر تھے، لیکن ان کے ناموں کی تصریح نہیں مل سکی، مراۃ العالم میں صرف اتنا ہے کہ:

(شیخ وجیہ الدین) در ترتیب و تالیف ربعے فتاویٰ عالمگیری شاہی مامور شدہ، دہ کس دیگر از فضلاء بمدد و اعانت او مامور شدند[1]

اگر اسی پر دوسرے حصوں کو بھی قیاس کیا جائے، تو مؤلفین فتاویٰ کی تعداد چالیس پچاس تک پہنچ جائے گی۔

۳۔ ایک حصہ کی تالیف شیخ محمد حسین جونپوری کے زیر اہتمام تھی، مراۃ العالم میں ہے:

ربعے از فتاویٰ عالمگیر شاہی باہتمام او (محمد حسین) زینت تمام یافت۔ (ص ۳۰۰)

ان کے معاونین کی تعداد اور ان کے ناموں کا علم نہیں ہو سکا۔

۴۔ انفاس العارفین[2] کی ایک عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ کسی حصہ کی تکمیل ملا حامد جونپوری کے زیر صدارت بھی ہوئی تھی، آگے ذکر آ رہا ہے کہ ایک [illegible] ملا نظام الدین ان سے ناخوش ہو گئے تھے۔

۱؎ قلمی نسخہ دار المصنفین ۲؎ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد کے حالات میں یہ کتاب لکھی ہے۔

(ملا نظام) ملا حامد را عتاب کرد کہ ایں جلد با اعتماد شما گذاشتہ بودم و تو پیش بادشاہ مرا خفیف کردید (ص ۲۴)

شاہ عبدالرحیم صاحب آپ کے معاونین میں تھے، اور شرکاء کی تعداد اور نام کی تفصیل نہیں معلوم ہوسکی۔

تلاش و تفحص سے انہی چار آدمیوں کے متعلق یہ تصریح مل سکی ہے کہ کسی نہ کسی حصہ کے جمع و ترتیب کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی، لیکن یقینی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کام چار ہی حصوں میں منقسم تھا۔ اور یہی چار اس کے ذمہ دار تھے یا اس سے زیادہ۔ راقم کے مضمون کو پڑھ کر اکتوبر ۴۷ء کے معارف میں برادر مکرم مولانا ابوظفر ندوی مرحوم نے تاریخ برہان پور (بحوالہ مراۃ العالم) سے جن ناموں کی فہرست دی ہے، ان میں سے دو ناموں علی اکبر سعد اللہ خانی اور محمد اکرم لاہوری کے متعلق مراۃ العالم یا کسی دوسری کتاب میں کوئی تصریح نہیں مل سکی کہ وہ کس حصہ کے صدر بنائے گئے تھے۔ بلکہ محمد اکرم لاہوری تو جامعین فتاویٰ میں بھی نہیں ہیں۔ محمد اکرم نام کے ایک دوسرے عالم جو بہار کے رہنے والے تھے، البتہ اس میں شریک تھے، لیکن انہیں بھی کوئی ذمہ دارانہ حیثیت حاصل نہ تھی۔

فتاویٰ کی تدوین میں عالمگیر کی شرکت

عالمگیر نے فتاویٰ کی تدوین کے لیے خزانۂ شاہی سے صرف ایک کثیر رقم کی منظوری اور علماء کی ایک جماعت کی تقرری ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ذاتی طور سے بھی وہ اس سے کافی دلچسپی لیتا تھا۔ اور روزانہ اس کے دو چار صفحے خود علمی و تنقیدی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اسکی فروگذاشتوں اور خامیوں پر ملا نظام الدین کو متوجہ کرتا رہتا تھا۔

27795

شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین میں اپنے والد شاہ عبدالرحیم صاحب

جو جامعین فتاویٰ میں تھے ان کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے اس پر روشنی پڑتی ہے، شاہ صاحب کہتے ہیں کہ:

والد صاحب نے ایک روز فرمایا کہ میں فتاویٰ عالمگیری پر نظرِ ثانی کر رہا تھا کہ ایک جگہ عبارت پیچیدہ تھی، سمجھ میں نہیں آئی، میں نے اصل ماخذ کی طرف رجوع کیا، تو معلوم ہوا کہ اس باب کے جامع نے دو عبارتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، جس کی وجہ سے مسئلہ پیچیدہ ہو گیا ہے، میں نے (غصہ میں) اس کے حاشیہ پر لکھ دیا کہ:

من لم یتفقہ فی الدین فقد حنث فیہ ھذا غلط وصوابہ ھکذا

جس نے دین میں تفقہ حاصل نہیں کیا اس نے دین میں کجروی کی، یہ غلط ہے اور صحیح یوں ہے۔

خود ملا نظام دو چار صفحات روزانہ بادشاہ کو لے جا کر سناتے تھے۔ ایک دن جب حسب معمول انہوں نے ان صفحات کو عالمگیر کے سامنے پڑھا، تو جلدی میں اس حاشیہ کی عبارت کو متن سے ملا دیا، جس سے مطلب خبط ہو گیا۔ بادشاہ نے ٹوکا اور پوچھا کہ یہ عبارت کیسی ہے، ملا نظام اس وقت کوئی جواب نہ دے سکے، اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں نے اس عبارت کا مطالعہ نہیں کیا تھا، جواب کل دوں گا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہ پر عالمگیر کی گہری نظر تھی اور فتاویٰ کی تدوین و تصحیح میں علمی حیثیت سے بھی وہ شریک تھا۔

فتاویٰ عالمگیر کا مترجم گذشتہ سطور میں فتاویٰ کے مترجم کے متعلق مرأۃ العالم کے ایک بیان کی کہ اس کے مترجم ملا عبداللہ ابن عبدالحکیم

سیالکوٹی ہیں، تردید کی گئی تھی، اور قیاس و قرائن کے علاوہ تبصرۃ الناظرین کے بیان کی روشنی میں یہ لکھا گیا تھا کہ اس کے مترجم ملا عبداللہ سیالکوٹی نہیں بلکہ عبداللہ چلپی ترکی ہیں۔ اب خود مراۃ العالم ہی میں دوسری جگہ ایک عبارت مل گئی ہے جس سے ہمارے اس قیاس اور تبصرۃ الناظرین کے بیان کی تائید اور اس کے اپنے بیان کی تردید ہوتی ہے عبارت یہ ہے:

چلپی عبداللہ رومی.... درزمان فردوس اشیانی از روم بہندوستان درآمی فقرا بسری برد........ ودریں عصر (عالمگیری) بہ روزیانہ سرفرازی یافتہ از تکالیف نوکری معاف ونیوشتن ترجمہ فتاوی عالمگیری شاہی مامور است (ص ۳۰۰ قلمی نسخہ)

جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے بظاہر نام کے اشتراک کے علاوہ اس غلطی کی دوسری کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

فتاویٰ کا دوسرا فارسی ترجمہ

فتاویٰ عالمگیری کے پہلے فارسی ترجمہ کے وجود کا جو عالمگیر کے زمانہ میں کیا گیا تھا ہمیں تو کوئی علم نہیں ہے۔ البتہ اس کے ایک حصہ کتاب الجنایات کا ایک دوسرا فارسی ترجمہ مع مختصر شرح موجود ہے، جسے مولانا نجم الدین ثاقب قاضی القضاۃ (متوفی ۱۲۲۹ھ) نے لارڈ سر جان شور (۱۷۹۳ء، ۱۷۹۸ء) کے مشورہ سے کیا تھا۔ ترجمہ کلکتہ اور لکھنؤ کے مطبعوں میں کئی بار چھپ چکا ہے۔ لیکن اس کا مطبوعہ نسخہ نظر سے نہیں گذرا۔ اس کے قلمی نسخے کتب خانۂ آصفیہ میں "ترجمہ فتاویٰ عالمگیری" اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں "کتاب الحدود والسرقہ" کے نام سے موجود ہیں۔ پٹنہ میں جو نسخہ ہے اس کے متعلق مرتب نے لکھا ہے کہ اس پر کتاب اور مصنف کا نام درج نہیں ہے، البتہ اس کی پشت پر کسی نے "کتاب الحدود" لکھ دیا ہے۔ لیکن مقابلہ سے یہ ترجمہ

مولانا نجم الدین کے ترجمہ سے حرف بحرف مل جاتا ہے۔ اس لیے گمان ہوتا ہے کہ یہ وہی ترجمہ ہے۔

کتاب الحدود حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

۱۔ باب اول، در بیان تفسیر حد موافق شرع و بیان رکن حد و بیان شرط حد و بیان حکم حد۔

۲۔ باب دوم، در بیان زنا فصل در بیان چگونگی حدہا و اقامت حدہا۔

۳۔ در بیان وطی کہ موجب حد است۔

۴۔ باب چہارم، در شہادت بزنا و رجوع ازاں شہادت۔

۵۔ باب پنجم، در حد شراب۔

۶۔ باب ششم در بیان قذف۔ فصل در بیان تعزیر۔

کتاب السرقہ کے ابواب کی یہ تفصیل ہے

۱۔ باب اول، در بیان سرقہ۔

۲۔ باب دوم، در بیان آں دزدے کہ دست بریدہ می شود، در بیان و در بیان آں دزدے کہ دست بریدہ نمی شود، در آں فصل در بیان حرز فصل در بیان چگونگی دست بریدن و ثابت گردانیدن آں۔

۳۔ باب سوم، در بیان چیزے کہ پیدا کند دزد آں چیز را در مال دزدی۔

۴۔ باب چہارم در بیان قطاع طریق۔

فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین کے حالات

فتاویٰ عالمگیری کی تالیف میں ہندوستان کے تقریباً تمام ممتاز علماء و فقہا شریک تھے اور خود عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اس سے ذاتی دلچسپی لیتے رہے اور خزانۂ شاہی سے اس کے اخراجات پورے کئے جاتے رہے، لیکن اس

عظیم کارنامہ میں کتنے حضرات شریک تھے افسوس ہے کہ اس کی پوری تفصیل نہ تو معاصر فارسی وقایہ نگاروں نے یکجا دی ہے اور نہ بعد کے تذکرہ نویسوں نے، سب سے پہلے استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا خیال آیا اور انہوں نے تاریخ اور تذکرہ کی بعض کتابوں کے حاشیہ پر دو چار جگہ مؤلفین فتاوی عالمگیری کی نشاندہی کی تھی، راقم الحروف نے حضرت سید صاحب کے انہی اشارات کی روشنی میں فارسی تاریخوں اور تذکروں کی ورق گردانی شروع کر دی اور تلاش وجستجو کے بعد یہ ۲۲، ۲۳ حضرات کے نام اس فہرست میں آسکے، مضمون کی اشاعت کے بعد برادرم مولانا ابوظفر صاحب ندوی اور مولانا محمد عون صاحب قادری پھلواری شریف نے دو ایک اور ناموں کا اضافہ کیا جن کے حالات ناظرین کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں، اس میں سب سے پہلا نام اس کام کے سب سے بڑے ذمہ دار یعنی صدر الصدور شیخ نظام کا آتا ہے اور انہی سے یہ فہرست شروع کی جا رہی ہے۔

۱۔ شیخ نظام برہان پوری نظام نام، برہان پور (گجرات) وطن تھا، ابتدائی حالات اور خاندان کے متعلق تذکروں میں کوئی تصریح نہیں ہے۔

قاضی نصیر الدین برہان پور کے متبحر اور متبع سنت عالم تھے، زیادہ تر انہی کی خدمت میں شیخ کی تعلیم وتربیت ہوئی اور استاذ کی توجہ اور نسبت سے خود بھی بڑے وسیع العلم متبحر عالم ہوئے۔[1]

عالمگیر کو شہزادگی کے زمانہ میں جب دکن کا انتظام سپرد ہوا تو وہیں شیخ نظام سے ملاقات ہوئی اور ان کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا، اور پھر

---

[1] تذکرہ علمائے ہند

آخر وقت تک جدا نہیں کیا شیخ نے اپنی استعداد وقابلیت سے حکومت کے بڑے سے بڑے عہدے اور مرتبے حاصل کئے۔

عالمگیر کی کوئی علمی، وسیاسی مجلس مشکل سے شیخ نظام کی شرکت سے خالی ہوتی تھی، صاحب مآثر عالمگیری نے متعدد جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے[1]، عالمگیر ان کا اتنا احترام کرتا تھا کہ آداب وتسلیم کی پابندی سے وہ مستثنیٰ تھے۔ محبوب الاحباب میں ہے:

از کورنش وتسلیم ودیگر تکالیف نوکری معاف بود (ص ۵۱۲)

جب فتاوی عالمگیری کی ترتیب وتالیف کے لیے علماء کی جماعت منتخب ہوئی تو اس کی صدارت شیخ نظام کو تفویض ہوئی۔ عالمگیر نامہ کا مصنف "فتاوی عالمگیری" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

د سرکردگی واہتمام این مہم صواب انجام بفضیلت مآب شیخ نظام کہ جامع فضائل معقول ومنقول است تفویض یافت۔ (ص ۱۰۸۷)

مرآۃ العالم اور مآثر عالمگیری میں ہے:

د سرکردگی این مہم اہم بقدوۃ انام شیخ نظام تفویض یافت۔ (ص ۲۷۴)

تذکرہ علمائے ہند میں ہے:

"در فتاویٰ عالمگیری سعی فراواں نمود۔"

شیخ عبدالرحمٰن بحراوی جن کی تصحیح کے بعد تیسری بار فتاویٰ عالمگیری ۱۲۸۱ھ میں مصر سے شائع ہوئی ہے، اپنے مختصر سے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"وجعل رئیسھم فی ذالک المولی الھمام الشیخ النظام۔"

زمانۂ وفات کے متعلق کوئی تصریح تذکروں میں نہیں ملتی، اتنا معلوم ہوتا ہے

---

[1] مآثر عالمگیری ص ۸۰-۸۳-۲۰۹

کہ اسی برس سے زیادہ کی عمر پائی، محبوب الاحباب میں ہے:

ہنگام تحریر کتاب مرأة العالم عمر شریف شیخ مذکور از ثمانین متجاوز بودہ (ص ۵۱۶)

محمد ساقی مستعد خان نے ان کے پسماندگان میں چار لڑکوں ملک منور، شیخ لاڈ، شیخ عبداللہ اور شیخ ابوالخیر کا ذکر کیا ہے ان میں تین ملک منور، شیخ لاڈ اور شیخ عبداللہ شاہی خطابات کے علاوہ منصب چار ہزاری سے بھی سرفراز تھے[1] اور شیخ ابوالخیر داروغۂ جائے نماز تھے[2]۔

۲۔ میر سید قنوجی

محمد نام اور میر خطاب تھا، قنوج کے باشندے، عہد عالمگیری کے مشہور اور وسیع العلم علماء میں تھے۔ ریاضی وادب میں خاص دستگاہ رکھتے تھے۔ شاہجہان نے بڑی تعظیم واکرام کے ساتھ انہیں دربار میں بلایا، اور اپنے مقربین میں شامل کیا[3]۔ شاہجہان کے بعد جب عالمگیر تخت نشین ہوا، تو اس نے بھی ان کے ساتھ وہی برتاؤ قائم رکھا، اور جب اکبرآباد سے دلی آیا[4] تو انہیں بھی اپنے پاس بلالیا۔

عالمگیر کو امام غزالی کی تصنیفات خصوصاً احیاء العلوم سے بڑا شغف تھا، اس نے امام کی اکثر کتابیں سید محمد قنوجی کی زیر نگرانی اور ان کی مدد سے مطالعہ کی تھیں، تذکرہ علمائے ہند میں ہے:

"مصنفات حجۃ الاسلام غزالی خصوص احیاء العلوم بیش وے (سید محمد) دیدہ" (ص ۲۱۶)

ان کو دربار میں کافی درخور حاصل تھا، عالمگیر کی ہر مجلس میں وہ شریک ہوتے

---

[1] مآثر ص ۳۰۹ [2] ایضاً ص ۱۹۷ [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۵ [4] ایضاً

تھے، شاہزادہ اعظم کا نکاح ان ہی کی وکالت میں ہوا تھا[1]۔ ۱۰۹۱ھ میں عالمگیر اودے پور اور اجمیر کی مہم میں گیا۔ اور وہاں کے سیاسی حالات کی وجہ سے کئی مہینہ رُک جانا پڑا، اس لیے سید محمد قنوجی نے اجمیر جا کر ان سے ملاقات کی۔ اس نے ان کا بڑا اعزاز و اکرام کیا، اور ایک ہزار نقد اور میووں کے دو خوان تحفہ میں پیش کئے[2]۔

جب فتاویٰ عالمگیری کی تالیف کے لیے علماء کا انتخاب ہُوا، تو قرعۂ انتخاب ان کے نام بھی پڑا۔ چنانچہ اس کی تکمیل میں ان کا بھی کافی حصہ تھا: تذکرہ علمائے ہند میں ہے:

"در تالیف فتاویٰ عالمگیری مساعی جمیل بکار بردہ" (ص ۲۱۶)

وفات کے متعلق کوئی تصریح تذکروں میں نہیں ملتی۔ صاحب مآثر عالمگیری ۱۰۹۷ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے:

"سید شریف پسر قدوۃ المشائخ میر سید محمد قنوجی استاذ اعلیٰ حضرت فردوس آشیانی (شاہجہان) جو فضل و کمال، عقل و شعور میں مشہور و معروف تھے کرورہ گنج کی خدمت میں مامور ہوئے"۔ (ص ۲۰۶)

اس بیان سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۰۹۷ھ سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ مآثر عالمگیری نے ضمناً ان کے دو لڑکوں سید شریف و سید احمد کا ذکر کیا ہے۔ سید شریف کرورہ گنج کی خدمت پر مامور تھے[3]۔ اور سید احمد قاضی محمد حسین کے انتقال کے بعد عہدۂ احتساب سے سرفراز ہوئے۔

تلامذہ میں مولوی اصغر علی قنوجی بڑے صاحب علم اور صاحب تصنیف گذرے ہیں[4]۔
(تحفہ ج ۲ ص ۴)

---

[1] اردو ترجمہ مآثر عالمگیری ص ۵۲ [2] مآثر ص ۸۵ [3] مآثر ص ۲۰۶ [4] تذکرہ علمائے ص ۱۴۱۔ ان کی چند تصانیف یہ ہیں: تصوف میں اللطائف العلمیہ، تبصرۃ المدار (باقی)

۳۔ ملا محمد جمیل جونپوری

جونپور کے ایک علمی خانوادے میں ۵۵۰اھ میں پیدا ہوئے ان کے دادا ملا شمس نور اور والد ملا عبد الجلیل اور دو چچا ملا صادق اور ملا خلیل اپنے زمانہ کے ممتاز علماء میں تھے۔ اسی ماحول میں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی، اور اسی علم پرور فضا میں پروان چڑھے۔

ابتدائی عربی و فارسی تعلیم کے بعد علامہ دیوان عبد الرشید سے مختصر المعانی اور شرح وقایہ وغیرہ پڑھیں۔ پھر مولانا نورالدین کے درس میں شریک ہوئے۔ ان سے درسی کتابوں کے علاوہ انوار علوم خاص طور سے پڑھنی شروع کی۔ ابھی کتاب ختم نہیں ہوئی تھی کہ استاذ نے دلی کا قصد کیا۔ شاگرد نے کتاب ختم نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کیا۔ استاذ نے فرمایا کہ اب تمہیں درس کی ضرورت نہیں ہے، مطالعہ کافی ہے۔

ملا جمیل طالب علمی کے زمانہ ہی سے ذہانت و طباعی میں ضرب المثل تھے، نہایت اخاذ طبیعت پائی تھی۔ ایک مرتبہ مطول کی کسی دقیق عبارت کا مطالعہ کر کے اپنے استاذ مولانا نورالدین کی خدمت میں گئے اور اس عبارت کا مطلب وضاحت سے بیان کیا۔ استاذ نے فرمایا کہ اس عبارت کا مطلب آج میں نے تمہاری تشریح سے سمجھا[1]

ملا جمیل کی فطانت اور ذہانت کی وجہ سے ان کے اساتذہ ان کو ملا جلال اور میر شریف کہا کرتے تھے۔ جب وقت وہ دہلی گئے تو سارے علماء پر ان کی ہیبت طاری ہوگئی مشاہیر جونپور میں ہے :

(بقیہ حاشیہ) تفسیر میں نوائب التنزیل اور اسکے علاوہ فصوص الحکم کی شرح اور کئی عربی قصیدے کی یادگار ہیں۔ [1] مشاہیر جونپور ص ۸۸

"آنچناں جودت ذہن بود کہ اگر یک بار متن کسے کتاب بدید حاجت حاشیہ نہ افتد، ہر مطالب دقیق کہ پیش آید فوراً بقوت ذہن حل گردد بار ہا استادش فرمودی کہ ملا جمیل را مماثل علامہ میر شریف و ملا جلال گفتن بیجا نیست، وقتے کہ ملا جمیل وارد دہلی شد، شہرۂ فضیلتش چناں شائع گردید وہیبتش تاری (طاری) شد کہ بر درس کہ رسیدے درس موقوف گشتے، روزے در مدرسہ لطف اللہ دہلوی رفت در یک سطر ہفت یا ہشت شبہا پیش نمود، ملا لطف اللہ از جوابش عاجز آمد تا"[1]

ان کی زندگی کا عزیز ترین مشغلہ درس و تدریس تھا، چنانچہ تعلیم سے فراغت کے بعد ہی مسند درس پر بٹھا دیئے گئے اور تشنگان علم ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے لگے، مشاہیر جونپور میں ہے:

"عالم جملہ علوم گردید و درس گفتن آغاز کرد وچناں شد کہ بہ زمرۂ علمائے مشاہیر پیوست و علم یکتائی برافراشت بسیارے طلبہ از وشاں فراغ خواندند" (ص ۸۷)

جونپور کے محلہ مفتی میں ایک بہت وسیع اور پختہ خانقاہ اور ایک مدرسہ تعمیر کرایا تھا، اور خود اس میں درس دیتے اور اصلاح باطن کرتے تھے۔ سید نور الدین اس معہد علمی اور روحانی کی بربادی پر بڑی حسرت سے لکھتے ہیں:

چوں زمانہ دگرگوں شد اکنوں آثارے ہم باقی نہ ماند جز اینکہ بر ایں سرزمین کہ پیش دروازہ شاہ طفیل حسین است کشت کاری می شود و چشم بصیرت مشاہدہ ہنجار و نیا می کند۔ (ص ۸۶)

ان کے تلامذہ کی تعداد بہت ہے، لیکن ان میں مولوی نظام الدین اورنگ آبادی،

---

[1] مشاہیر جونپور ص ۸۰

مولوی نورالہدی امبہٹوی اور ملا نور الدین جعفر غازی پوری زیادہ مشہور ہیں۔

اصلاح باطن مشاہیر جونپور میں ہے۔

علاوہ فضائل صوری صاحب کمالات باطنی ہم بود وبیعت

وارادت از دیوان عبدالرشید آورد (ص ۸۸)

اٹھتر برس کی عمر پاکر ۶ رجب ۱۱۲۴ھ میں وفات پائی اور اپنے والد ملا عبدالجلیل کی قبر کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے، ذیل کی رباعی سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

مرد ملا جمیل علمش مرد — خانہ باقی نہ صاحب خانہ

بر تاریخ فاضل نامی — از فضیلت ربود افسانہ

پس ماندگان میں تین صاحبزادوں کا ذکر صاحب مشاہیر جونپور نے کیا ہے۔

مولوی غلام معین الدین عرف شاہ امید علی، شاہ طفیل حسین و شاہ نعیم الحسن۔

ان کی اصل علمی یادگار تو تلامذہ کی وہ کثیر تعداد ہے، جن کے ذریعہ ہزارہا تشنگان علم سیراب ہوئے۔ ان کے علاوہ کچھ قلمی یادگاریں بھی ہیں جن سے اہل علم آج بھی مستفیض ہو سکتے ہیں۔

آپ نے مطول، شرح جامی کے ایک باب عطف اور بہت سی دوسری کتابوں پر حاشیے لکھے۔ اس کے علاوہ دو رسالے ایک فقہ اور ایک تصوف میں تنبیہات جمیلی تحریر کیے، سب سے بڑا زندہ جاوید کارنامہ فتاوی عالمگیری کی تصنیف میں شرکت ہے، مشاہیر جونپور میں ہے:

وقتیکہ عالمگیر بادشاہ دہلی جہت نمود فتاوی منسوب باسم خود

فضلائے ناموران دیار ہند طلبید از جونپور ملا جمیل را برچیدہ وایشان را

بخود خاستہ شریک مجمع اجتماع نمود (ص ۸۰)

۴۔ قاضی محمد حسین جونپوری جونپور کے باشندے اور اپنے وقت کے ممتاز علماء میں تھے، فرحۃ الناظرین میں ہے:

"از علم وفضل بہرہ وافر داشت۔" (ص ۸۲)

شاہجہاں کے عہد میں جونپور کے قاضی تھے۔ عالمگیر کے عہد میں الہ آباد کے قاضی مقرر ہوئے۔ جلوس عالمگیری کے ساتویں سال دربار شاہی میں حاضر ہوئے۔ عالمگیر نے انعام و اکرام کے علاوہ فوج کا عہدۂ احتساب بھی ان کے سپرد کر دیا، اور اس کے بعد سے برابر وہ اسی خدمت کو انجام دیتے رہے۔ محبوب الاحباب میں ہے:

" خدمت احتساب عسکر خلعت امتیاز پوشیدہ ورفع مناہی وترویج احکام رسالت پناہی وقمع آلات ملاہی کوشش و ارادہ بکار برد۔" (ص ۵۱۶)

بختاور خاں پر جو عالمگیر کا بہت مقرب امیر تھا، قاضی صاحب اور ان کے علم وتقویٰ کا بڑا اثر تھا، چنانچہ عالمگیر سے بھی ان کے علم وفضل، دیانت وتقویٰ کی تعریف کرتا تھا۔ ۱۰۷۹ھ میں عالمگیر نے ان کو عہدۂ احتساب کے علاوہ اور بھی مناصب ومراتب عطا کیے۔ مآثر عالمگیری میں ہے:

"بادشاہ ہنر پرور نے ان کو ایک صدی منصب دار مقرر فرمایا، رفتہ رفتہ قاضی محمد حسین اعانت وامداد اور اپنی سلیقہ شعاری سے مرتبہ امارت خانی پر سرفراز ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔" (ص)

ان کے ان کمالات کی بنا پر ان کو بھی فتاویٰ عالمگیری کی تالیف میں شریک کیا گیا، اور اس کی تکمیل میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ تذکرۂ علمائے ہند میں ہے:

"در تالیف فتاویٰ عالمگیری سعی نموده۔" (ص)

محبوب الاحباب میں ہے:

"یک ربع فتاویٰ عالمگیری تالیف نموده۔" (ص ۸۲)

مآثر عالمگیری کے بیان سے سنہ وفات ماہ ذیقعدہ ۱۰۸۰ھ ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ اس سنہ کے واقعات کے ضمن میں لکھتا ہے:

"قاضی محمد حسین کے انتقال کی وجہ سے سید احمد پسر سید محمد قنوجی کو خدمت احتساب عنایت ہوئی۔" (ص ۶۵)

ارباب تذکرہ نے اولاد و پس ماندگان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، اور نہ فتاویٰ عالمگیری کے علاوہ کسی دوسری علمی یادگار کا کوئی علم ہے۔

۵۔ شیخ وجیہہ الدین گوپامئوی

اودھ کا مشہور اور مردم خیز قصبہ گوپامئو ان کا وطن تھا۔ نہایت ہی ذہین، ذکی اور صاف باطن تھے، علم و فن کے علاوہ تحریر و تقریر میں بھی ملکہ تھا، علم معانی و بیان میں بے نظیر تھے۔ فرحۃ الناظرین میں ہے:

"خصوصاً در علم معانی و بیان عدیم المثال بود۔" (ص ۸۵)

شیخ جب دلی گئے تو پہلے پہل دارا شکوہ سے ان کا علمی تعلق رہا، دارا شکوہ کی وفات کے بعد عالمگیر کی حکومت کے نویں سال ۱۰۷۶ھ میں عالمگیر کے دربار میں حاضر ہوئے، اس نے حسب مرتبہ ان کی بڑی توقیر کی، اور منصب و مراتب سے بھی سرفراز کیا۔

فتاویٰ عالمگیری کی تالیف میں عالمگیر نے ان کی خدمات بھی حاصل کیں، محمد اسلم کے بیان کے مطابق ایک چوتھائی کام ان کے سپرد کیا گیا۔

"بہ ترتیب و تالیف ربعے از فتاویٰ عالمگیری مامور شد۔"[۱]

۱۔ تبصرۃ الناظرین

فتاویٰ کی تالیف میں ان کے کام کی نوعیت و اہمیت کا اندازہ ذیل کی عبارت سے بھی ہوتا ہے۔

زمخشری کی قسطاس کا ایک قلمی نسخہ خدا بخش خاں کی لائبریری میں ۱۲۰۰ھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اس پر شیخ وجیہہ الدین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی عبارت ہے، کاتب اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:

"عبارت منقول از دستخط مولانا وجیہہ الدین رئیس فتاویٰ عالمگیری"[1]

اس عبارت کے آخری ٹکڑے سے معلوم ہوتا ہے، کہ فتاویٰ کی تالیف میں ان کا کافی حصہ تھا، اور انہیں اس میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل تھی۔

۶- شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

نام ونسب: شاہ عبدالرحیم صاحب ۱۰۵۴ھ میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ وجیہہ الدین نے ان کا نام عبدالرحیم رکھا لیکن خواص میں ابوالفیض[2] کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

شاہ صاحب دادیہال کی جانب سے فاروقی اور نانہال کی طرف سے

---

[1] فہرست مخطوطات فقہ پٹنہ خدا بخش خان لائبریری۔

[2] بعض تذکرہ نویسوں نے ابوالفیض ان کی کنیت لکھی ہے، لیکن اس کی حقیقت شاہ ولی اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے کہ میں نے اپنے بعض دوستوں سے سنا کہ عالم بالا میں حضرت کا نام ابوالفیض ہے چنانچہ میں نے والد صاحب سے اس کے متعلق دریافت کیا تو وہ مسکرائے اور فرمایا کہ ہم چنیں است و نام تو ابوالفیاض است (انفاس العارفین ص ۸۴) ایسا ہی ہے اور میں ابوالفیض ہوں اور تم ابوالفیاض ہو۔

سید ہیں۔ جاری سلسلہ نسب یہ ہے:

عبد الرحیم ابن الشہید وجیہہ الدین ابن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی[1] قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی بدھ بن عبد الملک بن قطب الدین کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن شیر ملک[2] بن محمد عطا ملک بن ابو الفتح ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن بامان بن ہمایوں[3] بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

مشہور ہے کہ ننھیالی سلسلۂ نسب حضرت علیؓ تک منتہی ہوتا ہے لیکن بہت تلاش و جستجو کے بعد بھی مکمل شجرہ نہ مل سکا، نامکمل شجرہ یہ ہے:۔

والدۂ شاہ عبد الرحیم صاحب بنت شیخ رفیع الدین محمد بن قطب عالم بن عبد العزیز بن حسن بن طاہر[4]۔ (انفاس العارفین ص ۱۶۸)

شاہ صاحب کی والدہ کے سلسلۂ نسب میں عام تذکرہ نویسوں نے غالباً ذیل کی روایت کو اپنا ماخذ بنایا ہے۔

---

[1] ان بزرگوں کے نام میں قاضی اور کہیں مفتی کی نسبت ان کے علم و فضل کو ظاہر کرتی ہے۔

[2] ملک کا لفظ کسی امتیازی شان کا شارح ہے، شاہ ولی اللہ صاحب خود لکھتے ہیں کہ ملک در زمان قدیم لفظ تعظیم است مثل خان در زمان ما (انفاس ص ۱۵۸) [3] ہمایوں جرجیس وغیرہ سے عجمیت کا اظہار ہوتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی تین ہی پشت کے بعد یہ خاندان عرب سے عجم میں آگیا تھا [4] شیخ طاہر، شیخ حسن، شیخ عبد العزیز اور شیخ قطب عالم کا تذکرہ عبد الحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں بھی کیا ہے، لیکن شیخ طاہر کے اوپر کے سلسلۂ نسب کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ (اخبار الاخیار ص ۱۸۳-۲۶۶)

شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین میں لکھا ہے، کہ ایک روز والد مکرم شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنے ایک خواب کی تعبیر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

بحضرت عمر شجرۂ ما می رسد و بحضرت علی از جہۃ امہات نسل وصل می شود۔ (انفاس ص ۳۸)

لیکن از جہۃ امہات[1] کی مزید تشریح کی ضرورت ہے۔

شاہ صاحب کے اجداد کی ہندوستان میں آمد اور ان کے کارنامے

شاہ صاحب کے ننھیالی خانوادہ کے متعلق تو غالباً کسی نے یہ نہیں لکھا ہے کہ وہ کب ہندوستان آیا لیکن دادا میاں کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا[2] ہے کہ اس خانوادہ کے سب سے پہلے شخص جو ہندوستان آئے، وہ شیخ شمس الدین[3] مفتی ہیں، وہ

---

[1] امہات کا لفظ جمع ہے، اور جمع ہی پر محمول کرنا چاہیئے، معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنی والدہ کے ساتھ اپنی دادی زوجہ شیخ معظم اور زوجہ شیخ محمود کو بھی شامل کرلیا ہے کیونکہ یہ دونوں خواتین سونی پت کے سادات گھرانے سے تھیں (واللہ اعلم بالصواب)

[2] شاہ ولی اللہ صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"و این بزرگ مروے عالم دعابد بود ست و اول کسے کہ از نژاد قریش دران بلدہ (رہتک) آمد و بسبب وے شعائر اسلام ظہور نمود وطغیان کفر منتفی شد

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہلے سے مسلمان موجود تھے، لیکن ابھی تک کوئی ممتاز خاندان یہاں آباد نہیں ہوا تھا، ان کے دوسرے بھائی شیخ بہاؤ الدین تھے، جن سے مولانا فضل حق خیرابادی وغیرہ کا خاندان ہے۔

یہاں آکر پہلے دہلی کے قریب رہتک میں مقیم ہوئے، پھر وہیں متوطن ہو گئے، اس زمانہ میں حکومت کا دستور تھا، کہ شہر میں جو صاحب کمال اور ذی وجاہت آدمی ہوتا، بغیر کسی انتخاب اور تقرر کے وہاں کا عہدۂ قضا و احتساب اس کے سپرد ہو جاتا تھا۔ گو وہ قاضی اور محتسب کے نام سے موسوم نہیں ہوتا تھا شیخ شمس الدین چونکہ ذی وجاہت اور صاحب علم و فضل تھے، اس عام قاعدہ کے مطابق وہاں کے قاضی اور محتسب ہوئے [۱]

شیخ شمس الدین کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ کمال الدین اور شیخ کمال الدین کے صاحبزادے شیخ قطب الدین اور شیخ قطب الدین کے صاحبزادے شیخ عبدالملک یکے بعد دیگرے عہدۂ قضا و احتساب سنبھالتے رہے۔ شیخ عبدالملک کے زمانہ میں عہدۂ قضا نے قانونی شکل اختیار کر لی، اور حکومت کی طرف سے قضاۃ کا تقرر ہونے لگا۔ اور چونکہ یہ خاندان پہلے سے اس عہدۂ قضا پر سرفراز تھا۔ اس لیے اسی خاندان سے قاضی عبدالملک [۲] کا انتخاب عمل میں آیا، اور انھوں

---

[۱] شیخ شمس الدین کی آمد کا زمانہ سنہ کے اعتبار سے صحیح طور پر متعین نہیں کیا سکتا لیکن اگر علمائے انساب کے قیاسی اصولوں کو مشعل راہ بنایا جائے تو کچھ تقریب پیدا کی جا سکتی ہے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب کے اوپر بارہویں پشت میں شیخ شمس الدین پڑتے ہیں، اہل انساب کے اس حساب کے مطابق کہ تین پشت پر ایک سو برس گذر جاتے ہیں۔ بارہ پشتوں کا زمانہ چار سو برس قرار دیا جائے گا۔ شاہ عبدالرحیم صاحب کی پیدائش گیارہویں صدی کے وسط میں ہوئی ہے۔ اگر ان کی پیدائش کے زمانہ سے چار سو برس نکال دیے جائیں تو شیخ شمس الدین کی آمد کا زمانہ ساتویں صدی کے اوائل یا وسط کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

[۲] ان کے بعد سے قاضی کا لفظ ان کے اہل خاندان کے نام کا جزو بن گیا۔

انہوں نے اپنے اجداد کی وراثت سمجھ کر اسے قبول کرلیا۔ قاضی عبد الملک کے بعد ان کے صاحبزادے قاضی کبیر الدین عرف قاضی بدھ اور ان کے بعد قاضی قاسم اور قاضی قوام الدین عرف قاضی قادن وغیرہ اس عہدہ پر مامور ہوئے۔[۱]

عہدۂ قضا کے بجائے پیشۂ سپہگری

قاضی قادن کے فرزند شیخ محمود نے اپنے لیے اس عہدہ کو پسند نہیں کیا، اور اس کے بجائے حکومت کے دوسرے کاموں غالباً سپہ گری وغیرہ کو اختیار کیا، لیکن اس تبدیلی سے خاندان کی عزت و وجاہت میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔

شیخ محمود سے پہلے یہ خاندان علم اور تصوف دونوں میں ممتاز تھا، مگر انہوں نے تصوف کے ساتھ علم کے بجائے جسمانی قوت کو اہمیت دی، اور اس کے مظاہر جرأت، ہمت اور شجاعت و دلیری کا صدور ہونے لگا[۲] اور یہ سلسلہ کئی پشت تک چلا۔

قاضی محمود کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ احمد[۳] بھی باپ ہی کے نقش قدم پر چلے۔ ان کے بعد شیخ منصور[۴] بھی شجاعت و بہادری میں ضرب المثل تھے۔ ان کے

---

[۱] انفاس العارفین ص ۱۵۹ [۲] قاضی محمود کی شادی سونی پت کے سادات گھرانے میں ہوئی تھی، ان سیدہ کے بطن سے دو صاحبزادے احمد اور اعظم تھے [۳] شیخ احمد کے دو لڑکے شیخ منصور اور شیخ حسین تھے۔ شیخ احمد کی شادی شیخ عبد الغنی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ یہ شیخ عبد الغنی اپنے وقت کے بڑے برگزیدہ لوگوں میں تھے، اکبری دربار سے ان کا تعلق تھا، لیکن جب اکبر نے کفر و الحاد کا اظہار کیا، تو وہ دربار سے علیحدہ ہو گئے [۴] شیخ منصور کی دو شادیاں ہوئی تھیں، ایک شادی سے شیخ معظم اور شیخ اعظم تھے اور دوسری سے شیخ عبد الغفور و شیخ اسماعیل تھے۔

بعد ان کے صاحبزادے شیخ معظم یعنی شاہ عبدالرحیم صاحب کے دادا نے بھی فوجی خدمات کے سلسلہ میں بڑا نام پیدا کیا، شاہ ولی اللہ صاحب ان کی شجاعت اور بہادری کے متعلق لکھتے ہیں:

شیخ معظم[1] بدرجۂ قصوی از شجاعت وغیرہ متصف بود و وقائع عجیبہ دے دریں باب بیش از حد احصا است۔ (انفاس ص ۱۶۱)

شیخ معظم کی شادی بھی سونی پت کے ایک ممتاز گھرانے میں سید نور الجنان[2] کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ اس نیک بخت خاتون کے بطن سے تین صاحبزادے شیخ جمال، شیخ فیروز اور شیخ وجیہ الدین شاہ عبدالرحیم کے والد پیدا ہوئے۔

شیخ وجیہ الدین شیخ وجیہ الدین بھی اپنی خاندانی خصوصیات کے مالک تھے، ان کی شجاعت و بہادری کے قصے بھی عام طور سے مشہور ہیں۔ اور زیادہ تر لوگ ان سے اسی حیثیت سے واقف ہیں لیکن وہ ان خصوصیات کے ساتھ صلاح و تقویٰ میں بھی سر آمد روزگار تھے۔ تواضع و خاکساری جو شجاعت و بہادری کے ساتھ بہت کم جمع ہوتی ہے، وہ ان میں بدرجۂ اتم تھی۔

تلاوت قرآن تلاوت قرآن خاص معمول تھا، سفر میں ہوں خواہ حضر میں، روزانہ دو پارے بڑے ہی اہتمام اور سوز و گداز کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ان کی یہی قرآنی نسبت ان کی اولاد و احفاد میں منتقل ہوئی۔[3]

ورع و تقویٰ ورع و تقویٰ کا دامن بھی کسی حالت میں نہیں چھوٹا۔ عام طور پر

---

[1] انفاس العارفین میں ہے "موضع شکوہ پور کے تعلقہ شیخ معظم بود (ص ۱۶۱) اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ صاحب جاگیردار تھے [2] انفاس میں ہے کہ "سید نور الجنان کہ سیدے عالی نسب بود گرامیش (آبا و اجداد) بحلیہ فضل و علم متصف بودند (ص ۱۶۲) [3] انفاس ص ۱۶۲

جب کسی مہم پر فوجیں جاتی ہیں، تو راستہ میں ہر قسم کی بے عنوانیاں شروع کر دیتی ہیں۔ یہ بھی عالمگیر کی فوج میں ملازم تھے، اور بارہا محاذ جنگ پر بھیجے گئے، لیکن ان سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا، حتیٰ کہ کسی کے کھیت میں گھوڑے کو منہ تک مارنے نہیں دیا۔ بعض اوقات جب کسی فوج کو کسی کا نقصان کرتے ہوئے دیکھتے، اور نہ رہا جاتا، تو فوج کی عام شاہراہ کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کر لیتے۔

ایک مرتبہ فوج کو رسد نہیں پہنچ سکی، اس لیے عام فوجیوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ شیخ وجیہہ الدین پر دو تین فاقے گذر گئے، لیکن انہوں نے کسی غیر مشروع چیز کو اپنے لیے جائز نہیں رکھا۔ دو روز کے بعد اتفاق سے تھوڑے سے چنے کہیں پڑے ہوئے مل گئے۔ آپ نے ان کو بھگو کر سد رمق کا کام لیا۔

معاملات میں صفائی

لین دین اور خرید و فروخت کے علاوہ عام معاملات میں بھی شیخ وجیہہ الدین بہت محتاط اور امیر و غریب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب فرماتے ہیں:

معاملہ کہ والدم علیہ الرحمہ (شیخ وجیہہ الدین) با خدم و حشم و علف فروش وغیراں می کردند بوجہے از رفق و انصاف بود کہ از منقیان روزگار کم دیدہ می شود۔ (انفاس ۱۶۳)

والد محترم فوج سے لے کر گھاس بیچنے والے تک نرمی اور انصاف کا جو معاملہ کرتے تھے وہ اس زمانے کے متقیوں میں کم دیکھنے میں آیا۔

استغنا و قناعت

قناعت و استغنا ان کی خاص خصوصیت تھی۔ چنانچہ شاہ شجاع کے مقابلہ کے لیے عالمگیر نے فوج بنگال بھیجی تھی، اس میں شاہ وجیہہ الدین بھی تھے۔ انہوں نے اس جنگ میں بڑا کارنامہ دکھایا، اور ان کی تدبیر سے بڑی کامیابی ہوئی۔ عالمگیر نے

آگے چل کر نئے منصب اور مرتبہ میں اضافہ کرنا چاہا، مگر آپ کی قناعت پسند طبیعت نے اسے پسند نہیں کیا۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی فوجی ملازمت صرف دنیا طلبی کے لیے نہیں تھی، بلکہ اس میں دینی خدمت اور جہاد کی روح بھی موجود تھی، اس جذبۂ جہاد کا پتہ آپ کے واقعہ شہادت سے بھی ملتا ہے۔

واقعۂ شہادت

شاہ عبدالرحیم صاحب بیان فرماتے ہیں کہ والد صاحب حسب معمول ایک روز تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، سجدہ میں معمول سے زیادہ دیر ہوئی، اس سے مجھے خیال ہونے لگا کہ کہیں آپ کی روح پرواز تو نہیں کر گئی، لیکن دیر کے بعد جب آپ نے سجدہ سے سر اٹھایا، تو میں نے پوچھا آج آپ نے سجدہ میں اتنی دیر کیوں کی، فرمایا آج میں اللہ تعالیٰ سے بڑی آہ و زاری کے ساتھ یہ دعا کر رہا تھا کہ مجھے شہادت نصیب فرما چنانچہ مجھ پر دعا کی مقبولیت کا انکشاف ہو گیا ہے اور یہ بھی اشارہ مل گیا ہے کہ میری جائے شہادت دکن میں ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب بیان فرماتے ہیں کہ اس واقعہ سے پہلے ہی آپ شاہی ملازمت سے دست بردار ہو چکے تھے، اور فوجی کاموں سے نفرت پیدا ہو چکی تھی، دکن جانے کے لیے سامان سفر موجود نہ تھا، مگر آپ نے فوراً تمام سامان درست کیا، سواری کے لیے ایک عمدہ گھوڑا خریدا اور اس ارادہ کے ساتھ دکن روانہ ہوئے کہ شیواجی کا قلع قمع کروں گا جو دکن میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کر رہا ہے لیکن جب برہان پور (گجرات) پہنچے، تو اشارۂ غیبی ہوا کہ اپنی جائے شہادت پیچھے چھوڑ آئے ہو، اس لیے آپ وہاں سے پلٹ پڑے۔

---

[1] انفاس ۱۶۵

قصبہ پنڈبا میں کچھ تاجر بھی جو دلی جا رہے تھے۔ آپ کے ساتھ ہو گئے، اثنائے سفر میں ایک دن ایک سو سالہ بڑھیا جو ڈاکوؤں کی جاسوس تھی، افتاں وخیزاں آپ کے پاس آئی۔ آپ نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے۔ اس نے کہا دلی جانا چاہتی ہوں آپ نے اسے بھی قافلہ میں شامل کر لیا، اور وہ جتنے روز قافلہ کے ساتھ رہی، آپ کے ملازم سے کچھ پیسے روزانہ لے کر خرچ کرتی رہی۔ جب یہ قافلہ سرائے بزیا پہنچا۔ تو اس پیرزالہ نے اپنے ڈاکو ساتھیوں کو اطلاع کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکوؤں کی جماعت سرائے میں پہنچی۔ آپ اس وقت تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ دو تین ڈاکوؤں نے آپ کے سامنے آ کر پوچھا وجیہہ الدین کس کا نام ہے۔ جب معلوم ہوا کہ آپ کا نام ہے تو یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ ہمیں تم سے کام نہیں ہے کیونکہ تمہارے پاس مال ومتاع بھی نہیں ہے، اور پھر ہماری ہم جماعت نے نمک بھی کھایا ہے (غالباً یہ بڑھیا کے پیسہ لینے کی طرف اشارہ تھا) ہمیں اس قافلہ میں فلاں فلاں تجار سے کام ہے، اور انہی کا مال واسباب ہمیں لوٹنا ہے۔ ڈاکوؤں نے اگرچہ آپ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ لیکن آپ نے رفقائے سفر کا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں کیا، اور ان کی مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ اور دونوں طرف سے جنگ شروع ہو گئی۔ آپ نے بڑی پامردی سے ڈاکوؤں سے مقابلہ کیا۔ لیکن گروہ کا مقابلہ آسان نہ تھا، آپ کے بدن پر بیس بائیس گہرے زخم آئے تھے، جس سے آپ کا جسم بالکل چور ہو چکا تھا کہ اسی حالت میں ایک شقی نے گردن پر ایک کاری ضرب لگائی اور آپ کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ اس طرح آپ کی شہادت کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شہادت کے سنہ وتاریخ کی کوئی تصریح نہیں مل سکی۔

اولاد آپ کی شادی شیخ رفیع الدین محمد کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان کے

بطن سے تین صاحبزادے شیخ عبدالحکیم، شیخ ابوالرضا محمد اور شاہ عبدالرحیم پیدا ہوئے،

(حاشیہ صفحہ کا) ۱؎ شیخ رفیع الدین کا خاندان ملتان کا رہنے والا تھا۔ ان کے اجداد میں شیخ طاہر تعلیم کے لیے بہار گئے، تکمیل تعلیم کے بعد قاضی بدھ حقانی (بہار کے قاضی) نے اپنی صاحبزادی سے ان کی شادی کر دی، اس سلسلہ سے وہ کچھ روز بہار ہی میں رہے، پھر اپنے اہل و عیال کے ساتھ جونپور آئے اور وہیں متوطن ہو گئے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ حسن بھی کچھ روز جونپور ہی میں رہے۔ لیکن ۸۹۹ھ یا ۹۰۰ھ میں دہلی میں چلے آئے۔ تصوف میں ایک کتاب مفتاح الفیض آپ کی یادگار ہے (ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص ۳۶) ان کے صاحبزادے شیخ عبدالعزیز صاحب اپنے وقت کے بڑے مرتاض بزرگوں میں تھے ۸۹۸ھ میں پیدا ہوئے ۹۷۵ھ میں وفات پائی۔ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

اورا در تواضع و حلم و صبر و رضا و تسلیم و شفقت بر خلق و اعانت فقراء نظیر نہ بود، در زمان خود یادگار مشائخ چشت بود، در دہلی بوجود او سلسلۂ ارشاد و مشیخت برپا بود (اخبار الاخیار ص ۲۶۶)

شیخ عبدالعزیز وحدت وجود کے قائل تھے، کئی کتابیں بھی ان کی یادگار ہیں۔ وحدت وجود میں رسالہ عینیہ اور تصوف میں رسالہ عزیزیہ اور آداب السلوک ان کی یادگار ہیں۔ شیخ عبدالعزیز کے صاحبزادے شیخ قطب عالم یعنی شاہ عبدالرحیم کے پرنانا بھی اپنے وقت کے اتقیا میں تھے، محدث دہلوی لکھتے ہیں:

قطب عالم، عالم و فاضل و صاحب اخلاق حمیدہ و صفات پسندیدہ و قدم صدق و استقامت بر سجادۂ پدر نہادہ اوقات بطاعت و عبادت معمور دارد۔ (اخبار الاخیار ص ۲۶۶)

شیخ قطب عالم کے صاحبزادے شیخ رفیع الدین محمد شاہ عبدالرحیم کے نانا ہیں۔ یہ

(باقی صفحہ پر)

اور تینوں صاحب علم و فضل اور صاحب رشد و ہدایت ہوئے۔ ان میں سے شاہ عبدالرحیم صاحب کے حالات پیش کئے جاتے ہیں۔

شاہ عبدالرحیم صاحب کا اجمالی تعارف

شاہ عبدالرحیم صاحب نے علم و فضل،

(بقیہ حاشیہ) خواجہ باقی باللہ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ خواجہ باقی باللہ کو شیخ رفیع الدین سے اتنا شدید تعلق تھا، کہ لوگ ان کو خواجہ کا محبوب کہتے تھے۔ ان پر بھی وحدت وجود کا بڑا غلبہ تھا۔ آپ کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی شادی کا کوئی علم نہیں، دوسری شیخ محمد اعظم پوری کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ انہی کے بطن سے شاہ عبدالرحیم صاحب کی والدہ پیدا ہوئیں۔ آپ کی اس شادی میں خود حضرت باقی باللہ اور بہت سے صوفیا شریک تھے، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

خواجہ (باقی باللہ) لاچار شدند و اعظم پور رفتند، صوفیہ آں ناحیہ چوں مقدم خواجہ شنیدند ہمہ جمع آمدند و در نواحی صد کردہ کم کسے باشد از صوفیہ کہ در آں صحبت حاضر نشد مجلس عجیب کہ ہرگز مثل آں مسموع نہ شدہ (انفاس ص ۱۷۳)

شیخ رفیع الدین نے ایک دن گھر کا تمام سامان جمع کر کے اپنی تمام اولاد میں تقسیم کر دیا، جب چھوٹی صاحبزادی یعنی شاہ عبدالرحیم صاحب کی والدہ کی باری آئی، تو انھوں نے ان کو چند اوراق میں کچھ اوراد و وظائف اور اپنے پیروں کا شجرہ تھا، دیا۔ صاحبزادی کی والدہ نے کہا ابھی لڑکی کی شادی نہیں ہوئی، سامان شادی دینا چاہئے، یہ اوراق دینے سے کیا فائدہ۔ آپ نے فرمایا کہ یہ ہمارے بزرگوں کی اصل میراث ہے، جسے میں اس کو دے رہا ہوں انشاء اللہ اس کے بطن سے ایک لڑکا ہوگا، جو ہماری معنوی میراث کا مالک ہوگا، جب شاہ عبدالرحیم صاحب بڑے ہوئے تو ان کی نانی نے وہ اوراق ان کے حوالے کر دیئے، اور وہ واقعی اس معنوی میراث کے مالک ہوئے۔ (انفاس ص ۴)

جرأت، استغنا اور قناعت اپنے اسلاف سے بطور وراثت پائی تھی۔ شاہ صاحب کا دادیہالی اور نانہالی دونوں خاندان جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، ہمیشہ صاحب عزت و وجاہت رہے، اور ان کے اکثر و بیشتر افراد فضل و کمال صلاح و تقویٰ کا نمونہ تھے، اور یہ فیض تھا دودمان فاروقی اور مرتضوی سے نسبت و تعلق اور اس شراب دو آتشہ کا۔

شاہ صاحب نے اپنے اسلاف سے علم و فضل، رشد و ہدایت اور صلاح و تقویٰ کا جو خزانہ بطور وراثت پایا تھا، اس کی انھوں نے نہ صرف پوری نگہداشت کی، اور اسے ہمیشہ حرز جان بنائے رکھا، بلکہ اس اصل سرمایہ میں بے بہا اضافہ بھی کیا، آئندہ صفحات میں ان کے اسی کارنامے کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

تعلیم و تربیت اور ماحول

شاہ صاحب نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گھر کو علم اور دین کے چرچے سے معمور پایا، مدتوں تک اللہ و رسول کے ذکر کے علاوہ کان میں اور کوئی آواز نہیں پڑی، خاندان کے بزرگوں کی موجودگی کی وجہ سے خاندان کا ماحول بھی جادۂ اسلاف سے ہٹا نہیں تھا۔ آپ کے والدین خود شب زندہ دار اور تہجد گذار تھے۔ اس لیے بچپن ہی سے ان کی عبادت اور تہجد اور اذکار و اشغال کو دیکھتے اور ان میں شریک ہوتے تھے۔ اسی ماحول میں آپ کی تعلیم و تربیت شروع ہوئی اور اسی گہوارۂ احسان و تصوف میں آپ کی روحانیت پروان چڑھی۔

ابتدائی مکتبی تعلیم عام دستور کے مطابق گھر ہی پر ہوئی۔ جب سن شعور کا آغاز ہوا، تو عربی شروع کرائی گئی، عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے بڑے بھائی شیخ ابوالرضا محمد[1]

---

[1] انفاس ص ۱۵ نیز القول الجلیل میں ہے کہ شیخ ابوالرضا اپنے زمانے کے بڑے صاحب حال

(باقی صفحہ پر)

سے پڑھیں، دس سال کی عمر میں متوسطات کی تکمیل کرلی خود فرماتے ہیں :

"رسائل صغار تا شرح عقائد وحاشیہ، خیالی بخدمت مخدومی اخوی شیخ ابوالرضا گذرانیدم"

اس کے بعد میرزا زاہد[1] ہروی کی خدمت میں جو اکبر آباد میں عالمگیر کی طرف سے محتسب تھے، پہنچے اور بقیہ کتابیں ان سے پڑھیں۔

استاذ کی شفقت: شاہ عبدالرحیم صاحب میرزاہد کے عزیز ترین تلامذہ میں تھے۔ میرزاہد ان کی ذہانت اور طباعی کی وجہ سے ان سے اس قدر محبت کرتے تھے، کہ جس روز یہ مطالعہ کرکے نہیں آتے تھے، اس روز بھی ایک دوسطریں پڑھا دیتے، کہ ناغہ نہ ہونے پائے خود فرماتے ہیں:

ایشاں با من التفات بسیاری کردند بحدے کہ می گفتم کہ امروز مطالعہ نہ کردہ ام می گفتند یک دوسطر خوانید کہ ناغہ نشود۔

(انفاس ص ۳۲)

(بقیہ حاشیہ) اور صاحب کرامت بزرگ ہوئے ہیں۔ شاہ عبدالرحیم صاحب اور ان کے [illegible] روحانی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، اسی کے ساتھ ساتھ علمی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین میں ان کا حال بہت مفصل لکھا ہے۔

[1] اس وقت کے مشہور اساتذہ میں تھے۔ اور یونانی فلسفہ ومنطق، جو اس وقت تک معیار علم سمجھا جاتا تھا، میں ان کی حیثیت امام کی سمجھی جاتی تھی۔ مآثر الکرام میں ان کا تذکرہ تفصیل سے موجود ہے۔

استاذ اور شاگرد میں غایت تعلق کی وجہ سے ایک طرح کی مساوات اور بے تکلفی ہو گئی تھی۔ میر زاہد کے اس مساویانہ برتاؤ سے جو اپنے وقت کے ارسطو اور افلاطون سمجھے جاتے تھے، لوگوں کو سخت تعجب ہوتا تھا۔[1]

ایک روز عالمگیر نے میر زاہد کو کسی ضرورت سے بلا بھیجا، وہ جانے کا قصد کر ہی رہے تھے کہ شاہ عبد الرحیم صاحب پہنچ گئے انہوں نے مکان کا دروازہ بند کر دیا، اور کہا کہ جب تک میرا فلاں کام نہ ہو جائے گا آپ کو نہ جانے دوں گا۔ میرزا صاحب نے کہا اس وقت پراگندہ خاطر ہوں۔ بادشاہ کے پاس سے واپس ہو کر اس کام کو انجام دوں گا۔ لیکن شاگرد نے پھر اصرار کیا، آخر کار وہ ٹھہر گئے، اور اس کام کو انجام دینے کے بعد دربار میں گئے۔[2]

جودت طبع اور قوت مطالعہ

شاہ صاحب لڑکپن ہی سے نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ جودت طبع اور قوت مطالعہ کا یہ حال تھا، کہ ان کے اساتذہ اور ہم سبق ان کے نئے نئے سوالات اور اعتراضات سے گھبرا جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے بڑے بھائی شیخ ابوالرضا سے خیالی پڑھ رہے تھے، اثنائے درس میں کوئی اعتراض کیا، شیخ نے جواب دیا، لیکن انہیں تسکین نہیں ہوئی، انہوں نے دوبارہ اعتراض کیا، اور استاد و شاگرد میں بحث و مباحثہ نے اتنا طول کھینچا کہ استاد ناخوش ہو گئے، اور انہوں نے پڑھانا چھوڑ دیا۔

شرح ملا جامی میں عطف کے بیان میں ایک عبارت دقیق ہے جس کے حل کرنے میں اکثر فضلاء اٹک جاتے ہیں، مطالعہ کے دوران ان کے دل میں اعتراض پیدا ہوا، صبح کو انہوں نے اسے اپنے ہم سبق شیخ حامد سے بیان کیا،

---

[1] انفاس ۳۳ [2] ایضاً

انہوں نے کہا کہ میرے ذہن میں بھی یہی اعتراض آیا تھا۔ شاید توارد ہوگیا ہے، دوسرے روز اس اعتراض کو حل کیا، اور اس عبارت پر ایک دوسرا اعتراض پیدا کیا۔ اسی طرح کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا[1]

اگرچہ تعلیم کی تکمیل میر زاہد کی خدمت میں کی تھی، لیکن یہ تحصیل تحصیل حاصل تھی۔ اس لیے کہ اکثر کتاب کے شروع کا حصہ میر زاہد سے پڑھتے تھے، اور آخر کے حصہ کا خود درس دیتے تھے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

اگرچہ اتمام تفصیل بخدمت میر زاہد کردم، اما گویا تحصیل حاصل می شد بسا می بود کہ از اول کتاب می خواندم و از آخر درس می گفتم[2] (انفاس ۱۶)

یہ تو صاف پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے حدیث وفقہ اور تفسیر کس سے پڑھی، مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابوالرضا ہی سے پڑھی ہوگی۔ اس لیے کہ ان کے دوسرے استاد میر زاہد ہروی ہیں، جو اس کوچہ سے بالکل نابلد تھے، اور تیسرے کسی کے سامنے انہوں نے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا، اور حقیقۃً ان علوم کی تکمیل میں تعلیم وتعلم سے زیادہ ان کی فطری مناسبت اور بزرگوں کی محبت کا اثر تھا۔

درس وتدریس شاہ صاحب نے تکمیل تعلیم کے بعد ایک مدرسہ قائم کیا[3] جس میں انہوں نے درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ ان

---

[1] انفاس ص ۱۵ [2] یہ اس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں جو اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا اور مسلم معقولی تھا [3] اس مدرسہ کا نام آپ کے بعد مدرسہ رحیمیہ پڑا۔ آج بھی یہ مدرسہ اسی نام سے زندہ ہے۔

کے درس میں فقہ و تصوف، کلام و فلسفہ کے علاوہ قال اللہ وقال الرسول کی آواز بھی، جو ہندوستان میں ابھی بہت عام نہیں ہوئی تھی، سنائی دیتی تھی۔ شاہ ولی اللہ صاحب کو قرآن وحدیث کی وہ روشنی جس کو انھوں نے اتنا پھیلایا کہ سارا ہندوستان منور ہو گیا۔ سب سے پہلے اپنے والد شاہ عبدالرحیم ہی کے درس سے ملی تھی۔

آپ کی دی ہوئی کئی سندیں آپ کے مجموعۂ مکتوبات[لے] میں موجود ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ تین چیزوں کی اجازت آپ خاص طور سے دیتے تھے۔ تفسیر، حدیث اور تصوف، ایک سند میں فرماتے ہیں:

اجزتہ لدرس التفسیر والحدیث۔

دوسری سند میں فرماتے ہیں:

وتعلم منی علم التفسیر والحدیث والتصوف۔

آپ کے علم وفضل کے بیان میں ہم اس کی اور تفصیل کریں گے۔ آپ کے تلامذہ اور متوسلین کی فہرست بہت ملی جلی ہے۔ اس لیے ہم دونوں کی فہرست آگے چل کر ایک ہی جگہ دیں گے۔

روحانی تربیت علم ظاہر کے ساتھ ہی ساتھ گھر کے ماحول میں ان کی باطنی تربیت بھی شروع ہو چکی تھی۔ اور غیر محسوس طور پر ان کی روحانیت فروغ پا رہی تھی۔ شاہ صاحب کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ احسان اور تصوف سے ان کو فطری لگاؤ تھا، جس کے آثار بچپن ہی سے نمایاں ہونے لگے

لے انفاس رحیمیہ کے نام سے آپ کے چھوٹے صاحبزادے شاہ اہل اللہ صاحب نے آپ کے مکاتیب کو جمع کیا تھا۔ جو مطبع مجتبائی میں ۱۹۱۵ء میں چھپ گیا ہے۔ اس مجموعہ میں آپ کی دی ہوئی کئی سندیں بھی نقل کی ہیں۔

تھے، خود بیان فرماتے ہیں کہ میرے ماموں شیخ عبدالحیؒ اپنے لڑکوں کی حالت دیکھ کر فرماتے تھے کہ:

ترسیدم کہ سر اسلاف ما از عقب ما منقطع گردد۔

مجھے خوف ہے کہ اپنے اسلاف کا طریقہ ہمارے بعد منقطع نہ ہو جائے۔

لیکن ایک روز مجھے بڑے اہتمام سے وضو کرتے ہوئے دیکھا تو بے حد مسرور ہوئے، اور فرمایا کہ:

حالا معلوم شد کہ حامل آں سرور خاندان ما بودہ است اگر در اولاد پسر نیست چہ باک در اعقاب دختری ہست۔ (انفاس ص ۴)

اب معلوم ہوا کہ اب بھی خاندان کی لاج رکھنے والا موجود ہے اولاد نرینہ ہیں نہ سہی اولاد دختری ہی میں سہی۔

ان کے علاوہ دوسرے بزرگوں نے بھی ان کے صلاح و رشد کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا تھا، کہ یہ بچہ اس راہ میں کسی ممتاز شخصیت کا مالک ہوگا۔ شاہ صاحب کے مرشد حافظ سید عبداللہ صاحب نے ایک مرتبہ ان سے فرمایا کہ جب تم چھوٹے تھے، اور لڑکوں کے ساتھ لہو و لعب میں مشغول رہتے تھے۔ اس وقت سے میری طبیعت تمہاری طرف مائل تھی، اور میں تمہارے لیے یہ دعا کرتا تھا کہ:

یارب خدایا ایں طفل را از اولیا گرداں (انفاس ص ۱۱)

بارہ برس کی عمر میں آپ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو خواب میں دیکھا، اس کے بعد سے آپ کے روحانی ذوق میں ایک غیر معمولی انقلاب پیدا ہوا۔ اور ذکر و اذکار میں پہلے سے زیادہ دلبستگی پیدا ہو گئی۔

بیعت کا مقصد یوں تو اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر آپ نے احسان و تصوف کی بہت سی منزلیں طے کر لی تھیں، لیکن اس میں پختگی اور دوام

کے لیے کسی ہاتھ میں ہاتھ دینے کی ضرورت تھی۔ اس خواب کے بعد آپ نے بیعت کا قصد کیا۔ لیکن ابھی اس کی نوبت نہیں آنے پائی تھی، کہ ایک روز حضرت خواجہ نقشبند شیخ عبدالعزیز شکر بار کو خواب میں دیکھا کہ وہ فرما رہے ہیں:

اے فرزند ارادت بکسے بدہ تا آنکہ حضرت خواجہ ترا قبول نہ فرمایند۔

شاہ صاحب صبح کو حضرت خواجہ خرد (حضرت باقی باللہ کے صاحبزادے) کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور خواب کی تعبیر پوچھی اور تعبیر ملنے سے پہلے ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ شہر میں اس لقب (خواجہ) سے آپ کے سوا کوئی مشہور نہیں ہے۔ غالباً یہ اشارہ آپ ہی کی طرف ہے، اس لیے اپنی خدمت میں قبول فرما لیجئے۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ اس خواب میں اشارہ میری طرف نہیں ہے۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ انشاءاللہ تم کو زیارت نصیب ہوگی۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد یہ سعادت بھی نصیب ہوئی۔

کچھ روز کے بعد پھر خواجہ خرد کی خدمت میں حاضر ہو کر دوبارہ بیعت کی درخواست کی۔ انہوں نے از راہ تواضع یہ عذر کیا کہ میں اتباع سنت میں متساہل ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ تمہارا قدم جادۂ شریعت سے ذرہ بھی الگ ہو۔

بیعت کا مشورہ

شاہ صاحب نے کہا کہ پھر آپ ہی مشورہ دیجئے کہ میں کس سے بیعت ہو جاؤں۔ خواجہ خرد نے فرمایا کہ اگر سید آدم بنوری کے خلفاء میں کوئی مل جائے تو اس سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے حافظ سید عبداللہ کا نام لیا۔ خواجہ صاحب نے تائید فرمائی۔ چنانچہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے بیعت ہوئے فرماتے ہیں:

باوجود آنکہ طریق اخفاء و خمول بر ایشاں غالب بود در اول مرۃ بیعت قبول نمودند۔ (انفاس ص ۶)

حافظ صاحب ان کو بے حد عزیز رکھتے تھے، کبھی کوئی خدمت نہیں لیتے تھے۔ اگر وہ کبھی ارادہ بھی کرتے تو حافظ صاحب ٹال دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہ صاحب خدمت کی غرض سے حاضر ہوئے۔ مرشد نے تھوڑی سی خدمت لے کر فرمایا کہ:

این خطرہ (خدمت) را بخاطر خود راہ ندہید کہ جمیع حقوق صحبت چہ ظاہری وچہ باطنی ہمہ عفو کردم۔ (انفاس ص ۱۲)

خدمت نہ کرنے کا جو خیال لاحق ہے اسے دل سے نکال دو میں نے ظاہری و باطنی ہر طرح کی خدمت سے بری کر دیا ہے۔

اس دوران میں آپ کی آمد و رفت خواجہ خرد کے پاس بھی ہوتی رہی، اور ان سے بھی استفادہ اور صحبت کا سلسلہ جاری رہا۔ اگرچہ شاہ صاحب ان سے باقاعدہ بیعت نہ تھے۔ لیکن ان کی صحبت سے پورا فائدہ اٹھایا۔ خواجہ صاحب کی حیثیت تقریباً مرشد کی تھی۔ مگر انھوں نے شاہ صاحب سے ہمیشہ عزیزانہ برتاؤ رکھا۔ ایک مرتبہ شاہ عبدالرحیم سے خواجہ صاحب کی مجلس میں کسی مے خوار سے بحث ہو گئی۔ شاہ صاحب ناخوش ہو کر چلے آئے، اور ارادہ کیا کہ اب خواجہ کی مجلس میں نہ جاؤں گا۔ دو تین روز کے بعد خواجہ خرد خود ان کے مکان پر آئے، اور بہت ہی لطف و محبت سے ناخوشی دور کی[1]

خلیفہ ابوالقاسم حافظ صاحب کی وفات کے بعد آپ کو کسی دوسرے مرشد کی تلاش ہوئی۔ کسی نے ابوالقاسم اکبرآبادی[2] کا ذکر کیا۔ شاہ صاحب اکبرآباد ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ شیخ نے ان کی بڑی پذیرائی کی، اور بہت شفقت اور عنایت سے پیش آئے۔ ان کی تربیت میں خاص توجہ کی، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

---

[1] انفاس ص ۱۸ [2] انفاس

تا آنکہ بعض قدیماں برمن حسد می بردند (انفاس ص ۲۰) یہاں تک کہ:

حضرت خلیفہ کو اس قدر تعلق خاطر تھا، کہ جب شاہ صاحب کو بیعت وارشاد کی اجازت دی تو ایک بڑی دعوت کی جس میں بہت سے خواص وعوام شریک ہوئے، اور اس مجمع کے سامنے حضرت خلیفہ نے شاہ صاحب کے سر پہ دستار ارشاد وخلافت باندھی۔

شاہ عبدالرحیم کو بھی مرشد سے بڑی محبت تھی خود فرماتے ہیں کہ حضرت خلیفہ مجھ سے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ درویشاں شہر را زیارت کنید (شہر کے دوسرے بزرگوں سے بھی ملاقات کیا کرو) لیکن میں اس سے اس لیے پس وپیش کرتا تھا، کہ مرشد سے تعلق کی یکسوئی میں فرق نہ آجائے۔

ایک دن حضرت خلیفہ نے شاہ صاحب سے فرمایا کہ سید عظمت اللہ (جو چشتیہ سلسلہ کے بڑے برگزیدہ بزرگ تھے) کی خدمت میں جاؤ۔ ان کو حسب معمول اس میں تامل ہوا۔ تو آپ نے خادم سے کہا کہ ان کو سید صاحب کی خدمت میں لے جاؤ۔ چنانچہ آپ خادم کے ہمراہ سید صاحب کی خدمت میں گئے وہ زنان خانہ میں صاحب فراش تھے۔ اس لیے پہلے تو انہوں نے معذرت کردی۔ لیکن جب حضرت خلیفہ کی نسبت کا خیال آیا تو خادم سے چارپائی اٹھوا کر باہر تشریف لائے اور شاہ صاحب سے نام ونسب پوچھا، انہوں نے بتایا، مگر شیخ عبدالعزیز شکر بار کی نسبت کا اظہار نہیں کیا۔ مگر باتوں باتوں میں جب سید صاحب کو اس بات کا علم ہوگیا، تو وہ فوراً چارپائی سے نیچے اتر آئے، بے حد تواضع وشفقت فرمائی، ان کے سر پر عمامہ باندھا، اور کچھ نقد اور کچھ تبرکات جو شیخ عبدالعزیز شکر بار نے ان کے دادا کے حوالہ کیے تھے وہ شاہ صاحب کے سپرد کردیئے؛

شاہ صاحب یہ تبرکات لے کر خلیفہ کی خدمت میں آئے، اور ان کے سامنے انہوں نے فرمایا کہ:

نقد اشارت است جمعیت ظاہر و عمامہ اشارت باجازت
وجمعیت باطن دریں ہر دو امر شریک تواں شد۔ (انفاس ص ۲۸)

نقد سے اطمینان ظاہری کی طرف اشارہ ہے اور عمامہ سے جمعیت باطن کی طرف اشارہ اور یہ دونوں چیزیں کم جمع ہوتی ہیں۔

اس جمعیت ظاہر کی بشارت کے بعد خود شاہ عبدالرحیم صاحب کا بیان ہے کہ معاشی پراگندگی کا سوال ان کی زندگی میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوا۔ اور نہ جمعیت باطن کی اس خوشخبری کے بعد انہیں حیات اخروی کے لیے کبھی کوئی دشواری اٹھانی پڑی۔ (الفرقان ولی اللہ نمبر ص ۱۸۶)

تلامذہ اور متوسلین شاہ صاحب کے تلامذہ اور متوسلین کی کوئی تفصیل تذکروں میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے صحیح تعداد تو نہیں بتائی جا سکتی، لیکن ان کے مکتوبات اور حالات کے ضمن میں جن لوگوں کے نام مل گئے ہیں۔ وہ درج ذیل ہیں:-

۱۔ شاہ ولی اللہ ۲۔ شاہ اہل اللہ شاہ صاحب کے چھوٹے صاحبزادے جنہوں نے ان کے مکتوبات "انفاس رحیمیہ" کے نام سے جمع کیے ہیں۔

۳۔ شیخ محمد[1] ۴۔ شیخ معظم ۵۔ دلدار بیگ ۶۔ شیخ زین العابدین[2] ۷۔ شیخ عبداللہ جیو، شیخ ابوالقاسم کے صاحبزادے ۸۔ شیخ عبدالوہاب ۹۔ خواجہ احمد ۱۰۔ شیخ عبیداللہ ۱۱۔ حبیب الدین ۱۲۔ فیض اللہ ۱۳۔ حسام الحق یا حسام الدین یہ اسماء

---

[1] ان کے نام کئی خط ہیں [2] ان کے نام بھی متعدد خطوط ہیں

انفاس رحیمیہ سے لیے گئے ہیں ۱۴۔ مولوی نذر محمد جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مشہور تھے ۱۵۔ شاہ گل، یہ نام شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات سے لیے گئے ہیں ۱۶۔ شیخ محمد فاضل ۱۷۔ شیخ عبداللہ چلپی[له] مترجم فتاویٰ عالمگیری ۱۸۔ مرزا علی خوانی ۱۹۔ شیخ محمد غوث پھلتی یہ نام انفاس العارفین سے لیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کے متوسلین میں دو خاتونوں کا بھی نام ملتا ہے۔ ۲۰۔ ام عبیداللہ انفاس رحیمیہ میں ان کے نام ایک خط موجود ہے ۲۱۔ بی بی شریفہ خانم شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ از مستفیضان جد شریف بود صاحب توجہ وکشف۔ (ص ۱۱۹)

طبابت اور ذریعۂ معاش

شاہ صاحب کے خاندان میں امراض روحانی کے علاج کے ساتھ ساتھ جسمانی امراض کے معالجہ کا بھی سلسلہ قدیم سے چلا آرہا ہے، خود شاہ صاحب نے اس کی تکمیل کی تھی۔ اور اس میں مہارت بہم پہنچائی تھی۔ ان کی مہارت فن کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔

ایک مرتبہ بارہسہ کے دیہات میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں ان کے سامنے کسی مریض کا قارورہ لایا گیا۔ انہوں نے دیکھ کر نسخہ تجویز کر دیا۔ اس وقت ایک ہندو طبیب موجود تھا۔ اس نے کہا کہ آپ نے مرض کی تشخیص اچھی طرح کر لی ہے۔

له شاہ صاحب نے ان کا بڑا شہرہ سُنا تھا، ایک دن ان سے ملنے گئے مگر مل کر کچھ خوش نہیں ہوئے۔ ایک روز کسی مجلس میں شاہ صاحب سے ان کی پھر ملاقات ہو گئی۔ عبداللہ چلپی نے کوئی دعا پڑھی اور اعراب میں کچھ غلطی کی۔ شاہ صاحب نے انہیں ٹوکا، اس طرح سے دونوں میں کچھ مناظرہ کی شکل پیدا ہو گئی۔ لیکن آخر میں عبداللہ چلپی نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اور شاہ صاحب سے بیعت ہو گئے۔ (انفاس العارفین ص ۵۴)

یا نہیں، شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا، یہ عورت کا قارورہ ہے اسے فلاں فلاں بیماری ہے، اور اس کے یہ اسباب ہیں۔ اس طبیب نے پھر آپ سے پوچھا کہ یہ کس کتاب میں ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ:

ایں طب نیست فراست صادقۂ محمدیان است (انفاس ص ۵۹)

یہ کسی طب کی کتاب میں نہیں ہے بلکہ فراست امت محمدیہ ہے۔
ان کی مہمات فن کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

درطب حدس ایشاں بغایت رساد سلیم بود (انفاس ۸۶)

شاہ صاحب کے بعد بھی یہ فن ان کے خاندان میں علمی حیثیت سے باقی رہا، مگر عملی حیثیت سے شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کا سلسلہ بند کر دیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے ملفوظات میں ہے:

حکمت ہم در خاندان ما معمول بود، چنانچہ جد بزرگوار وعم فقیر (غالباً شاہ اہل اللہ صاحب) دواحی کردند والد ماجد بندہ موقوف ساختہ (ص ۲۲)

لیکن یہ تصریح نہیں مل سکی کہ شاہ عبدالرحیم صاحب یا ان کے اجداد نے طبابت کا پیشہ ذریعۂ معاش کے لیے اختیار کیا تھا، یا صرف خدمت خلق کے لیے یا دونوں شکلیں تھیں، "دواحی کردند" اور موقوف ساختہ وغیرہ الفاظ سے دونوں صورتیں نکل سکتی ہیں۔ مگر قرائن[1] سے پتہ چلتا ہے کہ اس پیشہ کو شاہ صاحب یا ان کے اجداد

---

[1] ان کے اجداد میں مفتی شمس الدین سے قاضی محمود تک غالباً عہدۂ قضا ہی ذریعہ معاش رہا۔ اس کے بعد فوجی ملازمت شروع ہوئی، اور غالباً عہدۂ قضا کی جگہ اس نے لے لی، شاہ صاحب کے شیخ معظم شاہی ملازمت کے ساتھ ساتھ ایک بڑی جائداد کے بھی مالک

(باقی ص۵۸ پر)

نے ذریعۂ معاش نہیں بنایا تھا۔

وفات فرخ سیر کے عہد میں بروز چہارشنبہ ۱۲ ر صفر ۱۱۳۱ھ ۷۷ برس کی عمر میں وفات پائی اور مقام مندیوں جہاں اس خانوادہ کے دوسرے گوہر شب چراغ پوشیدہ ہیں، آپ بھی مدفون ہوئے۔

علم و فضل اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ شاہ عبدالرحیم صاحب دہلوی علیہ الرحمہ کے اجداد میں قاضی محمود نے عہدۂ قضا چھوڑ کر حکومت کے دوسرے کام سنبھال لیے تھے، جس سے ان کے خاندان میں علم کا چرچا بالکل ختم تو نہیں ہوا۔

(بقیہ حاشیہ) تھے یشیخ وجیہہ الدین یعنی شاہ صاحب کے والد بھی عالمگیر کی فوج میں ملازم تھے۔ اس لیے ان میں کسی کو طبابت کے ذریعۂ معاش بنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ شاہ عبدالرحیم صاحب نے البتہ نہ کوئی ملازمت کی اور نہ شاہی دربار اور امراء سے کوئی مدد لی، اس لیے وہ طبابت کو ذریعۂ معاش بنا سکتے تھے۔ مگر ان کے حالات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ صلحا کے طریقہ کے مطابق انھوں نے بھی قناعت و توکل ہی کی زندگی بسر کی۔ اور مستقل طور سے کوئی ذریعۂ معاش اختیار نہیں کیا۔ لیکن مرشد کی دعا کے مطابق انہیں جمعیت ظاہر کی دولت ہمیشہ نصیب رہی۔

شاہ صاحب کے محلہ میں ایک بزرگ خواجہ ہاشم رہتے تھے۔ انھوں نے ایک دن شاہ صاحب سے بطور امتحان کہا کہ میں ایک درود جانتا ہوں، جس کے پڑھنے سے آدمی متمول ہو جاتا ہے۔ آپ نے ان کے جواب میں فرمایا:

خدائے تعالے مرا بواسطہ والد من قدر ضروری می رساند دیگر احتیاج ندارم۔ (انفاس ص ۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والد محترم شیخ وجیہہ الدین کچھ جائداد چھوڑ گئے تھے۔

مگر اس میں کمی ضرور آگئی۔ قاضی محمود کے بعد بھی بہت دنوں تک اس خاندان میں علمی زندگی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی۔ لیکن شاہ عبدالرحیم صاحب کی ذات سے دوبارہ چرچا شروع ہوا اور انہوں نے خاندان کی قدیم علمی روایات کو زندہ کیا اور پھر سے ان علمی مشاغل کو رواج دیا۔ جو ایک ایک کرکے خاندان سے مٹ رہے تھے۔ شاہ صاحب کی علمی استعداد اور ذہانت کا کچھ تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ چند واقعات یہاں بھی بیان کیے جاتے ہیں۔

شاہ صاحب کے استاد میر زاہد ہروی نے معقولات اور علم کلام کی کتابوں پر جو اہم حواشی (زوائد ثلاثہ) لکھے ہیں، آج تک عربی درسگاہ اور خصوصاً درس نظامی کا ضروری جزو ہیں۔ ان اہم اور دقیق حواشی کی تحریر و ترتیب میں شاہ عبدالرحیم صاحب کی بھی شرکت تھی۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

ظاہراً تسوید حاشیہ شرح مواقف بہ تقریب قرأۃ حضرت ایشاں بود۔ (انفاس ۳۴)

والد محترم کے درس کی وجہ ہی سے مواقف کا حاشیہ انہوں نے لکھا۔

شاہ عبدالعزیز اس کو اور واضح طور سے لکھتے ہیں:

و شریک مسودۂ حواشی بودند۔ (ملفوظات ص ۸۲)

وہ اس حاشیہ کے لکھنے میں شریک رہے۔

فقہ پر شاہ صاحب کی بڑی گہری نظر تھی۔ خود ان کے استاد میر زاہد کو بھی اس کا اعتراف تھا۔ ایک مرتبہ کسی رئیس نے میر زاہد سے شرح وقایہ پڑھنے کی خواہش کی۔ میر زاہد نے منظور تو کر لیا، مگر جب تک شاہ صاحب موجود نہیں ہوتے تھے، سبق نہیں پڑھاتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

امیرے شرح وقایہ می خواند بے حاجد بزرگوار سبق نمی فرمود (ملفوظات ص ۸۲)

علمی مجلسیں اور مباحثے سید شیخ علم اللہ (شیخ آدم بنوری کے خلیفہ) نے تمباکو کی تحریم[1] میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ اور قرآن کی اس آیت:

فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین۔

اس روز کا انتظار کیجیے جب آسمان پر ایک صاف اور ظاہر دھواں دکھائی دے۔

سے تحریم پر استدلال کیا تھا، انہوں نے اس رسالہ کو اپنے دو شاگردوں کے ذریعہ علمائے دہلی کے پاس تصویب کے لیے بھیجا، اتفاق سے وہ طالب علم سب سے پہلے یہ رسالہ شاہ عبدالرحیم کے پاس لائے، انہوں نے دیکھ کر فرمایا کہ اس آیت سے یہ استدلال غلط ہے، اور اس کے شان نزول[2]، علمائے تفسیر کی آراء اور فقہ وحدیث کی روشنی میں اس آیت کا مطلب واضح کیا، وہ لوگ تائید کے متوقع تھے اس لیے شاہ صاحب کی بات پسند نہیں آئی۔ اور وہ ناخوش ہو کر چلے گئے۔

ملا یعقوب تمباکو کی اباحت کے قائل تھے۔ اور اس کے جواز کے ثبوت کے لیے درس کے اوقات میں بھی حقہ پیتے تھے۔ سید علم اللہ کے شاگرد شاہ صاحب

---

[1] دلی میں اس وقت تمباکو کے جواز اور عدم جواز اور تحریم و اباحت پر بڑے زور کی مناظرانہ بحثیں اور رسالہ بازی ہو رہی تھی، سید شیخ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ عہد عالمگیری کے مشہور بزرگ اور حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد ہیں جن کا مزار تکیہ رائے بریلی میں ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے ان کے حالات میں مستقل کتاب لکھ دی ہے۔

[2] اس آیت میں قحط زدوں کی حالت اور کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔

کے یہاں سے ملا یعقوب کے پاس پہنچے اور ان کے سامنے رسالہ پیش کیا، انہوں نے اباحت کے دلائل کو ان کے سامنے بیان کیا، وہ دونوں طالب علم پھر شاہ صاحب کے پاس آئے، انہوں نے فرمایا کہ تم نے تحریم کا جو دعویٰ پیش کیا تھا وہ تو بہرحال غلط ہے۔ اس کے بعد آپ نے ملا یعقوب کے استدلالات کے متعلق فرمایا کہ ان سے جا کر پوچھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد اسی لیے تو حرام کر لیا تھا، کہ حضرت زینبؓ نے کہا تھا کہ آپ کے منہ سے مغافیر (بدبودار پھول) کی بو آتی ہے، شہد سے آپ کی کراہت کی وجہ کیا تھی؟ حدیث میں لہسن اور پیاز کے کھانے کے بعد فلا یقربن مسجد نا (ہماری مسجد کے قریب نہ جائیں) کا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوشبو کو پسند اور بدبو کو ناپسند فرماتے تھے، ان آیات اور احادیث سے کیا یہ پتہ نہیں چلتا کہ رسول خدا کو ہر بدبودار چیز ناپسند اور بار خاطر ہوتی تھی، اس لیے اتباع سنت اور تقویٰ کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس قسم کی تمام چیزوں کو ترک کر دیا جائے۔ یہ دونوں طالب علم پھر ملا یعقوب کے پاس آئے، اور شاہ صاحب کی پوری تقریر نقل کی، ملا یعقوب نے اپنی لغزش کا اعتراف کیا اور حقہ پینا چھوڑ دیا۔ (انفاس ص ۸۰)

مسائل میں شاہ ولی اللہ صاحب کی اعتدال پسندی شاہ عبدالرحیم صاحب ہی کے فیض صحبت کا نتیجہ تھی۔

ایک مرتبہ شاہ صاحب کے مکان پر شہر کے علماء وصلحا کا مجمع تھا، اس مجمع میں ایک شخص نے سوال کیا کہ خواجہ حافظ تو کہتے ہیں کہ:

امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است
درحیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست

اور عقائد کی کتابوں میں لکھا ہے کہ دنیا میں خدا تعالیٰ کا دیدار نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، وجہ تطبیق کیا ہے، اس سوال پر سب نے اظہار خیال کیا، مگر کوئی بات طے نہ پا سکی۔ آخر میں لوگوں نے شاہ صاحب سے رجوع کیا۔ انھوں نے علمی انداز میں شعر کی تشریح کی اور فرمایا کہ:

خدائے تعالےٰ محتجب است محجوب نیست

یعنی وہ اپنی ذات کی طرف سے تو عیاں ہے، مگر ہماری آنکھوں کے لیے وہ پوشیدہ ہے۔

خواجہ صاحب نے حالت شوق میں فرمایا ہے کہ اے خدائے تعالےٰ تیرا جمال عام ہے اور یہ ہماری آنکھوں کا قصور ہے کہ تجھے دیکھ نہیں پائیں، تو پھر آنکھوں کا پردہ کیوں نہیں اٹھا دیتا، کہ وہ اس دنیا میں تجھے دیکھ لیں، وعدۂ فردا سے کیا فائدہ۔ تمام مجمع نے شاہ صاحب کی اس تشریح کی تحسین کی۔ اور اسے قبول کیا۔

ایک مرتبہ شاہ صاحب کسی صاحب حال بزرگ سے ملنے گئے۔ انھوں نے فرمایا میرے دل میں بہت دنوں سے یہ خدشہ پیدا ہو رہا ہے اور کسی طرح اطمینان نہیں ہوتا، کہ علماء کہتے ہیں، کہ دنیا میں رویت باری محال ہے، اور میں بالکل عیاں اور ظاہر طور سے دیکھتا ہوں، اگلے صوفیہ نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے، یہ شعر اسی معنی میں کہا گیا ہے۔

دیدہ را فائدہ آنست کہ دلبر بیند
در نہ بیند چہ بود فائدہ بینائی را

شاہ صاحب نے کہا آپ فرماتے ہیں کہ ظاہر و عیاں دیکھ رہا ہوں، یہ بصیرت کا بصر سے اشتباہ ہے، پھر فرمایا اپنی آنکھ بند کیجیے، انھوں نے بند کر

لی، شاہ صاحب نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کا وہ پہلا ادراک باقی ہے یا نہیں، انہوں نے فرمایا ہاں باقی ہے۔ شاہ صاحب نے فرمایا یہی اشتباہ کی پہچان ہے۔ اس وقت آپ کو (آنکھ بند کرنے کی صورت میں) جو ادراک ہو رہا ہے، وہ بصر کا نہیں بلکہ بصیرت کا ہے۔ اور آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ بھی بصر ہی کا ہے۔ اسی طرح آپ رویت باری کا مشاہدہ تو دیدۂ بصیرت سے کرتے ہیں مگر سمجھتے ہیں کہ یہ مشاہدہ بصر سے ہو رہا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی دقت نظر اور تطبیق بین المسائل کی خصوصیت میں بڑی حد تک شاہ عبدالرحیم کی اس متوازن ذہنیت اور تربیت کا بھی ہاتھ تھا۔ خود شاہ ولی اللہ صاحب نے کئی جگہ اس طرف اشارہ کیا ہے۔

متن قرآن کی تعلیم ہندوستان میں علم دانائی اور معقولات کے مقابلہ میں دوسرے دینی علوم کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہی ہے، اور اس سے بہت کم اعتنا کیا گیا۔ دسویں صدی ہجری میں محدث دہلوی کے فیض سے حدیث کا چرچا تو عام ہوا، مگر قرآن ابھی تک بیضاوی اور کشاف ہی کے ذریعہ سمجھا جا رہا تھا۔ متن قرآن کے پڑھتے پڑھانے کا رواج ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ہندوستان کے علماء میں شاہ عبدالرحیم صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن کو فلسفہ اور منطق کے سہارے کے بغیر پڑھا پڑھایا، اور ہندوستان میں اس سنت حسنہ کو زندہ کیا، ان کے بعد ان کے خانوادہ نے اس طریقہ کو اپنے ترجموں اور درس و تدریس کے ذریعہ عام کر دیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کہتے ہیں:

غالباً در حلقۂ یاراں بیروں از تلاوت ہر روز دو رکوع بہ تدبر و بیان معانی می خواندند۔ (انفاس ص ۸۶)

شاہ ولی اللہ صاحب جہاں اپنے اوپر انعام الٰہی کا ذکر کرتے ہیں، وہاں

اپنے والد کے اس طریقۂ درس کو اپنے لیے نعمت عظمٰی اور فتح عظیم فرماتے ہیں، جزء لطیف میں ہے:

> از جملہ منن عظمٰی بریں ضعیف آں بود کہ چند یار در مدرسہ قرآن عظیم با تدبر... بہ خدمت ایشاں حاضر شدم و ایں معنی سبب فتح عظیم افتاد۔ (انفاس ۲۴۳)

حکمتِ عملی عام طور پر علماء نے ارسطو کی فلسفیانہ حکمت نظری ہی کی طرف توجہ کی، اور اسی کو اپنا سرمایہ فخر سمجھا، اور حکمت عملی کی طرف جو خالص اسلامی چیز ہے، اس کی طرف توجہ بہت کم ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کے اکثر و بیشتر افراد زندگی کی انفرادی اور اجتماعی ضروریات میں عملی جدوجہد سے یکسر محروم ہوگئے۔ اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ لوگ کشاکش حیات میں کوئی کام نہیں آ سکتے۔ لیکن شاہ عبدالرحیم کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ انھوں نے حکمت نظری کے ساتھ ساتھ حکمت عملی کو بھی اپنایا اور اس کو زندگی میں برتنے اور سیکھنے پر زور دیا، انفاس میں ہے:

> حضرت ایشاں ... عقل معاش مثل عقل معاد کامل وو افر داشتند و در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیار می آموختند (ص ۸۰)

شاہ ولی اللہ صاحب کو حکمت عملی کی تعلیم جس کو انھوں نے پھیلا کر ایک دفتر بنا دیا، سب سے پہلے گھر ہی سے ملی تھی۔ فرماتے ہیں:

> (حضرت ایشاں) ایں فقیر را در مجلس صحبت حکمت عملی و آداب معاملہ بسیار می آموختند۔ (ص ۸۴)

اب آخر میں شاہ صاحب کے کچھ حکیمانہ جملے نقل کئے جاتے ہیں۔

ذوقِ سخن شاہ صاحب کو ذوق سخن سے بھی حصہ ملا تھا۔ اور وہ بڑے سخن فہم

اور کسی حد تک سخن گو بھی تھے۔ افہام و تفہیم کے وقت بکثرت اشعار پڑھتے تھے۔ اشعار میں ایسے نکات پیدا کرتے تھے کہ ان کے بزرگ بھی تحسین کے بغیر نہیں رہتے تھے۔ ان کی نکتہ آفرینی کے دو ایک واقعے اوپر نقل کئے جا چکے ہیں، ایک واقعہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پہلی مرتبہ اپنے مرشد خلیفہ ابوالقاسم کی خدمت میں گئے تو وہ گھر کی تعمیر میں مشغول تھے۔ اور زبان پر یہ شعر جاری تھا۔

ہر کرا کہ ذرہ وجود بود   پیش ہر ذرہ در سجود بود

شاہ صاحب نے وجود کے لفظ کو شہود سے بدل کر پڑھا۔ حضرت خلیفہ نے فرمایا کہ میں نے صحیح نسخوں میں لفظ "وجود" ہی دیکھا ہے۔ شاہ صاحب نے عرض کیا، جی ہاں! میں نے بھی ایک صحیح نسخہ دیکھا ہے، جس میں لفظ "شہود" ہے۔ حضرت خلیفہ اس وقت مشغول زیادہ تھے۔ اس لیے اس روز بات یہیں ختم ہو گئی۔ دوسرے روز شاہ صاحب پھر ان کے پاس گئے تو انہوں نے پوچھا اگر لفظ "شہود" مانا جائے تو شعر کے معنی کیا ہوں گے۔ شاہ صاحب نے عرض کیا کہ:

ہر کسے را کہ اول شہود حضرت حق در ذرات عالم پیدا شد
لا محالہ پیش ہر ذرہ سجود خواہد کرد۔ (انفاس ص ۲۰)

جس کو ہر ذرہ میں اللہ تعالیٰ کا شہود ہو جائے گا وہ یقیناً ہر ذرہ کے سامنے سجدہ کرے گا۔

اور کہا کہ اگر "وجود" کا لفظ رکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عبد و معبود دونوں بالکل مجتمع اور متحد ہو گئے، تو پھر سجدہ کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سن کر مرشد نے فرمایا کہ صحیح نسخوں میں لفظ وجود ہے، اس کی کیا تاویل ہو گی۔ شاہ صاحب نے عرض کیا کہ اگر وجود کا لفظ صحیح ہے تو "وجود" کے معنی وجدان کے

ہوں گے، جو شہود کا ہم معنی ہے۔ یعنی جس کو خدا کا وجدان ہو جائے گا، وہ ذرہ ذرہ میں اس کا جلوہ دیکھے گا۔ اور اس کے سامنے سر بسجود ہو گا۔ حضرت خلیفہ اس نکتہ آفرینی سے بہت خوش ہوئے اور اس کے بعد سے ان کو بے حد عزیز رکھنے لگے۔

شاہ صاحب نے انفاس العارفین اور مکتوبات و ملفوظات میں سینکڑوں ہندی و فارسی اشعار استعمال کئے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کتنے اشعار شاہ صاحب کے ہیں، صرف دو فارسی رباعیوں اور ایک ہندی شعر کے متعلق یہ تصریح مل سکی ہے کہ وہ آپ ہی کے ہیں۔ ہندی شعر جس میں رحیم تخلص ہے یہ ہے:

جب جیو نہ تھا تب پیو نہ تھا اب پیو ہے جیو ناتھ
رحیم پیا سوں یوں رلی جوں بوند سمندر ساتھ [1]

ایک روز نماز ظہر کے بعد شاہ صاحب نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی۔

گر تو راہی حق بخواہی اے پسر خاطر کس را مرنجاں الحذر
در طریقت رکن اعظم رحمت است ایں چنیں فرمود آں خیر البشر

اور شاہ ولی اللہ صاحب سے فرمایا اس کو لکھ لو، میرے دل پر القا ہوا ہے،

---

[1] اس شعر سے ان کے مسلک وحدۃ الوجود پر روشنی پڑتی ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب ہمارا وجود نہ تھا، تو ہمارا کوئی معشوق بھی نہ تھا لیکن اب معشوق تو ہے مگر وجود باقی نہیں رہا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح پانی سمندر میں مل کر فنا ہو جاتا ہے، اسی طرح میں بھی خدا کی ذات میں اس درجہ مستغرق ہوں کہ کوئی الگ چیز رہ ہی نہیں گیا ہوں، یعنی میرے وجود پر اب اسی کا قبضہ ہے، میرا وجود خود میرے قبضے میں نہیں ہے۔

کہ میں تمہیں یہ وصیت کر جاؤں۔

یہ فارسی رباعی بھی ان ہی کی ہے۔

اے کہ نعمہائے تو از حد فزوں	شکر نعمتہائے تو از حد فزوں
عجز از شکر تو باشد شکر ما	گر بود فضل تو مارا رہنموں

تصنیف شاہ صاحب کی اولاد و احفاد، خلفاء وتلامذہ کی ایک بڑی تعداد ان کی بے بہا اور نہ مٹنے والی یادگار ہے اور جن کے ذریعہ انشاء اللہ ان کا علمی اور روحانی فیض قیامت تک جاری رہے گا، لیکن ان مادی یادگاروں کے علاوہ کچھ ان کی قلمی یادگاریں بھی ہیں، جو گو کمیت کے لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں، مگر کیفیت اور افادیت کے اعتبار سے بہت قیمتی اور قابل قدر ہیں۔

شاہ صاحب میں بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہو چکا تھا، مگر ان کے روحانی ذوق و استغراق نے اسے زیادہ ابھرنے نہیں دیا، خود ان کے مرشد خواجہ خرد ان سے ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ:

ہمیں وصیت می فرمودند کہ خود را از درس و تدریس و مطالعہ کتب و حکایات غیر ضروریہ بکسو دارد و خود را بالکلیہ بآں نسبت (روحانی) گمارد۔

(انفاس ۴۷)

لیکن پھر بھی اس فطری ذوق کا کچھ نہ کچھ ظہور ہو کے ہی رہا۔

خیالی پر حاشیہ لکھنے کا خیال زمانۂ طالب علمی میں میر زاہد کے حواشی کی ترتیب و تسوید میں شاہ صاحب کی شرکت کا ذکر آچکا ہے۔ ان کی طالب علمی ہی کا ایک دوسرا واقعہ بھی ہے۔

ایک بزرگ نے آپ کو اسم ذات کے تصور کے دوام کی یہ تدبیر بتائی کہ تم کاغذ یا تختہ پر جس قدر ہو سکے، اس کو لکھتے جاؤ، کچھ روز کے بعد خود بخود ذہن

میں اس کا تصور بیٹھ جائے گا۔ چنانچہ شاہ صاحب نے یہ عمل شروع کر دیا۔ اس خامہ فرسائی سے ان کے ذوق تصنیف کو بھی تحریک ہوئی، اور ان کو ملا عبدالحکیم کے حاشیہ خیالی پر جس کے وہ طالب علم تھے، ایک دوسرا حاشیہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اور اس کو لکھنا بھی شروع کر دیا۔ مگر وہ خیالی کا حاشیہ کیا لکھتے، ان کے لوح دل پر اسم ذات کا نقش ایسا جم چکا تھا کہ وہی صفحۂ قرطاس پر ابھرنے لگا۔ اس غلبہ میں وہ پندرہ سولہ صفحات اسم ذات سے سیاہ کر گئے، اور ان کو اس کا احساس بھی نہ ہوا، کہ وہ حاشیہ لکھ رہے تھے، یا کاغذ پر نقطہ ہائے دل نمایاں ہو رہے تھے۔ خود فرماتے ہیں۔

خواستم کہ حاشیۂ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی بنویسم یک جزء کما بیش اسم ذات می نوشتم و شعور نداشتم۔ (انفاس ص ۵)

شاہ صاحب کے استغراق روحانی کی وجہ سے گویا یہ کام تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ مگر اس واقعہ سے ان کے تصنیفی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

تصوف کے ایک ادبی رسالہ کا ترجمہ

شیخ تاج سنبھلی[۱] نے حضرت خواجہ باقی باللہ کے طریقۂ ارشاد و تصوف پر سلف کی عبارت سے اخذ کر کے عربی میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ شاہ صاحب نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ جو ان کے خاندان میں بہت دنوں تک متداول رہا۔

---

[۱] شاہ ولی اللہ صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں: اول خلفاء حضرت خواجہ (باقی باللہ) بودند و در آخر بمکۂ معظمہ اقامت اختیار کردہ بحال جاں مدفون شدند و این فقیر از متاخران مشائخ اہل ہند ہیچ کس را ندید کہ اہل مکہ زیادہ از شیخ تاج معتقد باشند۔

مکتوبات صوفیہ کے مکتوبات اور ملفوظات میں تعلیمات کا بڑا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ جو باتیں ہزاروں صفحات کے مطالعہ سے نہیں معلوم ہوتیں وہ ان کے دو ایک جملوں میں معلوم ہو جاتی ہیں، گو ظاہری ترتیب و تبویب کے لحاظ سے انہیں تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔ مگر افادیت کے لحاظ سے اس کا درجہ کسی مستقل تصنیف سے کم نہیں ہوتا۔

شاہ عبدالرحیم صاحب نے بھی کچھ خطوط اپنے متوسلین و تلامذہ کو لکھے تھے۔ جس کو ان کے چھوٹے صاحبزادے شاہ اہل اللہ صاحب نے "انفاس رحیمیہ" کے نام سے جمع کر دیا ہے، گو اس کی ضخامت ۳۵۔ ۴۰ صفحات سے زیادہ نہیں ہے، مگر اس عجالہ نافعہ میں جو اخلاقی جواہر ریزے بکھرے ہوئے ہیں، وہ سینکڑوں ضخیم کتابوں سے قیمتی ہیں۔

شاہ صاحب کے ایک دوسرے "مجموعہ مکتوبات" کا ذکر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی نے کیا ہے۔ جس کا قلمی نسخہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں ان کی نظر سے گذرا تھا[1] معلوم نہیں اس کو کس نے جمع کیا ہے۔ اور وہ "انفاس رحیمیہ" سے کتنا مختلف ہے۔ اگر کبھی اس تک رسائی ہوئی تو تو انشاء اللہ اس پر کچھ لکھا جائے گا۔

فتاویٰ عالمگیری فتاویٰ کی تالیف[2] میں ملا حامد کے معاون کی حیثیت سے شاہ صاحب بھی شریک تھے، گو بعض اسباب کی بنا پر وہ زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے، پھر بھی جتنے دنوں رہے، بڑے مفید اور قیمتی

---

[1] مقدمہ سیرت سید احمد شہید [2] فتاویٰ عالمگیری کی تالیف میں ان کی شرکت کا مختصر ذکر اوپر آ چکا ہے اب اس کی مزید تفصیل کی جاتی ہے۔

اضافے کئے، ذیل میں ان کی شرکت کا پورا واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

فتاویٰ کی تدوین کا کچھ کام ملا حامد کے سپرد تھا۔ ملا حامد مرزا زاہد کے درس میں شاہ صاحب کے ہم سبق رہ چکے تھے، اس تعلق کی بنا پر ازراہ ہمدردی انھوں نے شاہ صاحب سے اس میں شرکت کے لیے لکھا اور کچھ مالی معاوضہ کی بھی امید دلائی۔ شاہ صاحب شاہی ملازمت پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے انھوں نے انکار کر دیا۔ ان کی بیوہ والدہ کو اس کی خبر ہوئی تو بہت برہم ہوئیں، اور باصرار اس خدمت کے قبول کر لینے پر مجبور کیا، ناچار شاہ صاحب نے اس میں شرکت کر لی، لیکن جب شاہی ملازمت کی خبر ان کے مرشد حضرت خلیفہ ابو القاسم کو ہوئی تو اب انھوں نے ناپسندیدگی ظاہر کی، اور ترک ملازمت کا مشورہ دیا۔ شاہ صاحب نے والدہ کی ناخوشی کا عذر کیا، لیکن مرشد نے فرمایا:

اذا جاء حق اللہ ذهب حق العباد۔

جب خدا کا حق آ گیا تو بندہ کا حق باقی نہیں رہا۔

شاہ صاحب نے مرشد سے پھر عرض کیا، کہ آپ دعا فرمائیں کہ ملازمت خود بخود چھوٹ جائے تاکہ والدہ کی ناراضگی کا سوال نہ پیدا ہونے پائے، مرشد نے اس پر رضامندی کا اظہار کیا، اور دعا فرمائی۔

عالمگیر کے سامنے کارکنوں کے عزل ونصب کی فہرست ہمیشہ پیش ہوتی رہتی تھی۔ اب کی بار جو فہرست پیش ہوئی، تو اس نے شاہ صاحب کے نام پر بھی قلم پھیر دیا، اور ان کے یہاں یہ کہلا بھیجا کہ اگر وہ چاہیں تو اس کے بجائے کچھ زمین دے دی جائے لیکن دربار شاہی سے قطع تعلق ہی کے لیے دعا کرائی گئی تھی۔ اس لیے اس پیشکش کے قبول کرنے کا کیا سوال تھا۔ خود فرماتے ہیں کہ:

"قبول نکردم وشکرانہ بجا آوردم وحمد خدائے تعالیٰ گفتم"۔ (انفاس ص ۲۴)

شاہ صاحب کی معزولی کا اصل سبب تو ان کے مرشد کی دعا ہی تھی، لیکن اس دُعا کی قبولیت کے لیے کسی سبب ظاہر کی بھی ضرورت تھی، شاہ صاحب نے وہ ظاہری سبب یہ بتایا ہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ شاہ صاحب جس حصہ پر نظر ثانی کر رہے تھے، اس میں کوئی عبارت پیچیدہ تھی، اس پر انہوں نے ایک حاشیہ بڑھا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ملا نظام کو بادشاہ کے سامنے خفت اُٹھانی پڑی تھی۔ چونکہ یہ حصہ ملا حامد کے سپرد تھا، اس لیے ملا نظام نے ان سے باز پرس کی اور ان پر برہم ہوئے۔ ملا حامد تو اس وقت کچھ نہیں بولے مگر ملا نظام کے جانے کے بعد شاہ صاحب سے اظہار ملال کیا۔ شاہ صاحب نے کتاب کے مآخذ کی طرف رجوع کیا، اور مسئلہ کی پیچیدگی ان پر واضح کی، وہ بظاہر مطمئن ہو گئے، مگر ان کے دل میں ان کی طرف سے غبار باقی رہا، شاہ صاحب فرماتے ہیں:

> ازاں باز اکثر آں قوم برمن حسد بردند وبظاہر سبب ایں عزل حسد ایشاں بود۔ (انفاس ص ۴۴)

اکثر آں قوم سے غالباً وہ تمام لوگ مراد ہیں جنہیں شاہ صاحب سے علمی چشمک تھی، اور انہوں نے اپنی دانست میں شاہی ملازمت چھڑوا کر ان کو نقصان عظیم پہنچایا تھا۔

مسلک شاہ صاحب ہر چیز میں اعتدال اور توسط کو پسند کرتے تھے۔ اور مختلف مسائل میں فریق بن کر اختلاف کو بڑھانے کی بجائے ان میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس وقت تک علماء میں جو مسائل شرعی ہوں، خواہ ذوقی پیدا ہو چکے تھے۔ ان سب میں ان کا مسلک زیادہ تر خذ ما صفا ودع ما کدر تھا۔ شاہ صاحب صوفی تھے۔ مگر تصوف میں بھی ان کی راہ

تقشف و تقید کے درمیان تھی۔
شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

در ہر امر توسط دوست می داشتند نہ چنداں در تنسک و تعمق فرو رفتہ بودند کہ بہ رہبانیت کشد و نہ چنداں ترک تقید باآداب منزسل بودند کہ تہاونِ میل کند۔ (انفاس ص ۸۵)

اس طرح تصوف یا فقہ کے جتنے طریقے ہیں، ان میں کسی طریقہ کو اس حد تک پڑھنے پڑھانے یا ترجیح دینے کو جس سے دوسرے کی تنقیص ہونے لگے، بہت ناپسند کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

بار بار از فحوائے کلام حضرت ایشاں معلوم شد کہ تفضیل صاحب طریق دیگر لاسیما بر وجہے کہ بمنقصت مفضول مفضی باشد مکروہ می داشتند۔

(انفاس ص ۷۷)

وحدت الوجود صوفیہ میں وحدۃ الوجود کا مسئلہ ہمیشہ ایک معرکۃ الآراء مسئلہ رہا ہے، لیکن شیخ ابن عربی سے پہلے یہ مسئلہ خالص ذوقی اور وجدانی تھا، اس کی کوئی علمی یا شرعی حیثیت نہیں تھی۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس کو علمی اور نیم شرعی حیثیت دی۔ ان کے بعد سے عام صوفیہ نے ان ہی کی تقلید کی۔ اور یہ تقلید کی رسم ایسی عام ہوئی کہ ہر صوفی (ان میں مستثنیات بھی ہیں) خواہ اسکے ذوق و کیف سے آشنا ہو یا نہ ہو۔ وہ اپنے کو لذت آشنا ظاہر کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ اور بغیر اس کے اپنے کو ہلکا محسوس کرتا تھا۔ شیخ کے اس عقیدہ پر سب سے پہلے ابن تیمیہ نے اور ان کے بعد حضرت مجدد الف ثانی نے تنقید کی۔

امام ابن تیمیہ نے قرآن و حدیث اور آثار صحابہ کی روشنی میں وحدت وجود

کا ابطال کیا۔ مجدد الف ثانی نے جو قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ بادۂ معرفت کے بھی لذت شناس تھے۔ اس کی تردید بھی کی اور اصلاح بھی۔ اور ان کی "ہمہ اوست" کی تعبیر کو "ہمہ از وست" اور وحدت الوجود کو وحدت شہود اور عینیت کو دالیت و مدلولیت سے بدل دیا۔ جس سے ہر مسئلہ کی اصل صورت سامنے آگئی اور عوام کی گمراہی کے تمام منافذ بھی بند ہوگئے۔

شاہ عبدالرحیم کے زمانہ میں بھی یہ مسئلہ عام طور پر صوفیہ کا مرکز نظر بنا ہوا تھا۔ خود شاہ صاحب کے خاندان میں کئی ایسے بزرگ گذر چکے تھے[1] اور بعض موجود بھی تھے[2]۔ جو وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اس لیے ان پر بھی اس ماحول اور خاندان کا اثر تھا۔ وہ شیخ ابن عربی کے فلسفۂ وجود اور ان کی کتابوں کی طرف کافی حد تک مائل تھے۔ ابن عربی کی کتابوں سے ان کو اس قدر شغف تھا کہ اکثر فرمایا کرتے تھے:

> اگر خواہم فصوص را بر سر منبر تقریر کنم و جمیع مسائل آن را بآیات و حدیث مبرھن سازم و بوجہے بیان نمایم کہ ہیچ کس را شبہ نماند۔

(انفاس ص ۸۲)

لیکن ان کے مرشدین کے جذبۂ اتباع شریعت[3] اور مجدد صاحب کے

---

[1] مثلاً عبدالعزیز شکر بار اور شیخ رفیع الدین وغیرہ جو ان کے نانا اور پر نانا ہوتے تھے۔ جن کا ذکر اوپر آچکا ہے [2] مثلاً ان کے بڑے بھائی شیخ ابوالرضا محمد جن کی صحبت میں ان کی ظاہری اور باطنی تعلیم ہوئی۔ [3] ان کے مرشد سید عبداللہ اور خلیفہ ابوالقاسم دونوں اتباع شریعت پر بے حد زور دیتے تھے۔ سید عبداللہ حضرت آدم بنوری کے خاص تربیت یافتہ تھے اور حضرت آدم بنوری حضرت مجدد صاحب کے اجل خلفاء میں تھے۔ اس لیے مجدد صاحب کے روحانی فیض سے وہ خالی نہیں تھے۔

سلسلہ سے وابستگی نے انہیں اس مسئلہ میں بھی جادۂ اعتدال سے بہت کم ہٹنے دیا، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ اس کو ذوقی اور وجدانی چیز سمجھ کر عام طور پر اس کی تشریح سے گریز کرتے تھے کہ مبادا عام لوگ ذوق وشوق کی باتوں کو نہ سمجھ سکیں اور ورطۂ ضلالت میں پڑ جائیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

از تصریح وحدت وجود احتراز می نمودند کہ غالب اہل زمان آں را فہم نمی توانند کرد، و در ورطۂ الحاد و زندقہ می فتند۔

وحدت وجود کی تشریح سے اس لیے احتراز فرماتے تھے کہ لوگ اس کو سمجھ نہ سکیں گے اور بلاوجہ شبہات میں مبتلا ہو کر گمراہی کے گڑھے میں جا گریں گے۔

(انفاس ص ۸۲)

پھر بھی دل کا پیمانہ جس شراب سے لبریز تھا وہ کب تک اثر نہ دکھاتا۔ چنانچہ کبھی کبھی ان کی زبان سے ایسے فقرے نکل جاتے تھے جن سے اندرونی میلان کا پتہ چلتا ہے، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

کفر شریعت دو معبود پنداشتن و کفر حقیقت دو معبود دانستن۔

(مکتوبات ص ۳۳)

ایک دوسرے مکتوب میں اس کو یوں لکھتے ہیں:

معبود گفتن کفر شریعت و دو معبود دیدن کفر طریقت۔ (مکتوبات ص ۲۱)

تعلق حادث بالقدیم کی علمی انداز میں یوں توجیہ کرتے ہیں:

صور علمیہ کہ آں را ملاحظہ می نمایم تحقق و تقرر در خارج ندارند محض بقوۃ علمیہ ما متحقق اند و آں ہمہ علم ماست کہ بچندیں رنگ بر آمد، شبہ نیست کہ ایں صور را عین علم نتواں گفت زیرا کہ علم بود و ایں صور نمودند و منفصل از علم نیز نتواں گفت زیرا کہ ایں

تلونات راقیوم و منشا بود۔ (انفاس ص ۸۲)

وہ صور علمیہ جسے ہم ملاحظہ کرتے ہیں خارج میں ان کا کوئی تحقق نہیں ہوتا محض بالقوۃ وہ موجود ہوتی ہیں یہ سب ہمارا علم جو اس رنگ میں ظاہر ہوتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان کو عین علم نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ علم تو موجود رہے گا اور اس کی صورتیں نہ رہیں گی۔

مسئلہ صفات کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

صفات عین ذات اند بمعنی آنکہ ذات فقط در صدور آثار از صفات زائدہ قائمہ بذات کفایت می کند۔ (انفاس ص ۸۳)

قرآن کی اس آیت اینما کنتم وھو معکم (تم جہاں ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے) کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا کہ:

ایں معیت محض بعلم نیست بلکہ در تحقق و تقرر نیز دریں جا قدم نمی آید زیرا کہ ایں معیت جوہر بجوہر یا عرض بعرض یا جوہر بعرض نیست معنی است لطف ازیں معیات۔ (انفاس ص ۸۲)

اس مسئلہ معیت کی ایک دوسری لطیف توجیہہ کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اس قسم کے تمام مسائل کو ذوقی اور وجدانی سمجھتے تھے، جن میں ہر شخص اپنی روحانی استعداد اور قوتِ مشاہدہ کے مطابق مختلف توجیہیں کر سکتا ہے، مگر کسی کے ذوق و وجدان اور قوتِ مشاہدہ کے فیصلہ کو دوسرے کے ماننے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ فرماتے ہیں:

ہر کسے بحسب استعداد خود از مسئلہ معیت حظے گرفتہ است طائفہ دانستہ اند کہ حق سبحانہ بعلم و قدرت وسمع و بصر محیط است قال اللہ تعالیٰ: یکون من نجوی ثلثۃ الآیۃ و طائفہ معاینہ کردہ

کہ ہر فعلے وانفعالے وحرکتے وصفتے کہ در عالم ظاہر است از حضرت حق است قال اللہ تعالیٰ قل کل من عند اللہ وما بکم من نعمۃ فمن اللہ و طائفہ مشاہدہ کردہ کہ ہر چہ ہست اوست وغیر او چیزے نیست قال اللہ تعالیٰ کل شئ ھالک الا وجہہ وقال ہو الاول والآخر والظاہر والباطن وطائفہ حق را در حق دیدند وعبارت از نکتہ این مقام قاصر است۔ (انفاس ۸۲)

عمل بالحدیث شاہ صاحب فقہ میں حنفی مسلک رکھتے تھے مگر اس وقت کے عام فقہا کی طرح جامد اور انتہا پسند نہیں تھے۔ بلکہ احادیث و آثار کا تتبع بھی کرتے تھے، اور جس مسئلہ میں جو مسلک حدیث کی روشنی میں انہیں صحیح معلوم ہوتا تھا، اسے اختیار کر لیتے تھے خواہ وہ حنفی مسلک کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ عام فرض نمازوں میں امام کے پیچھے اور نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

مخفی نماند کہ حضرت ایشاں در اکثر امور موافق مذہب حنفی عمل می کردند الا بعض چیزہا کہ بحسب حدیث یا وجدان بمذہب دیگر ترجیح یافتند از انجملہ آنست کہ در اقتداء سورۂ فاتحہ می خواندند و در جنازہ نیز۔ (انفاس ص ۷)

ایک مرتبہ شیخ عبدالاحد نے قرأۃ خلف امام کے بارے میں شاہ صاحب سے بحث کی، اور اس کی نفی میں یہ عقلی دلیل پیش کی کہ جب چند آدمی بادشاہ کے دربار میں کوئی غرض لے کر جاتے ہیں، تو اسے پیش کرنے کی خدمت ایک شخص کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ہر شخص اپنی اپنی عرضداشت الگ الگ پیش نہیں کرتا ہے[1]

---

[1] اصلا امام ابوحنیفہ کا مسلک قرأۃ خلف امام میں قیاس نہیں ہے قرآن کی آیت اور

(باقی صفحہ پر)

شاہ صاحب نے جواب میں فرمایا کہ اس پر نماز کا قیاس صحیح نہیں ہے، کیونکہ:

اصل در صلوٰۃ مناجات و تہذیب نفس است بدعا و خضوع چنانکہ حدیث لاصلوٰۃ لمن لا یقرء بام الکتاب دلالت می کند۔

اس کے بعد فرمایا خدا تعالیٰ ایسا سمیع (سننے والا) ہے کہ اگر ساری دنیا کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر اپنی اپنی مختلف عرضداشتیں اپنی اپنی زبان میں بیک وقت شروع کر دیں، تو بھی ایک ساتھ ہر شخص کی گذارش سن سکتا ہے، اس سے کسی دوسرے کی گذارش میں کوئی خلل نہیں پڑے گا۔

اس کے بعد ان سے فرمایا کہ اس زمانہ میں تو امام اپنی زبان سے لفظ الحمد کہتا ہے، مگر اس کی حقیقت اور نماز کی روح سے بالکل غافل ہوتا ہے، لیکن آپ امام کے تشویش ذہن سے احتراز نہیں کرتے، مگر دربار الٰہی میں چند آدمیوں کے ساتھ مناجات کرنے کو باعث تشویش سمجھتے ہیں۔

اسی طرح نماز سفر میں کبھی کبھی رخصت پر بھی عمل کر لیا کرتے تھے۔ اور قصر کے بجائے پوری نماز پڑھتے تھے۔ فرماتے ہیں:

در سفرے از اسفار در وقتے از اوقات صلوٰۃ بخاطرم رسید کہ قصر صلوٰۃ رخصت است گاہے باتمام ہم عمل باید کرد۔ (انفاس ص ۴۷)

توسل اس مسئلہ میں بھی عام متصوفین نے بہت سی بدعتیں پیدا کر دی

(بقیہ حاشیہ) وہ حدیثیں ہیں جن میں امام کی قرأت کے وقت خاموش رہنے کا حکم دیا ہے اور وہ حدیث جس میں قرأۃ الامام اور قرأۃ لہ آیا ہے لاصلوٰۃ الا بفاتحۃ پر بھی اس سے عمل ہو جاتا ہے قرآن کی آیت اور ان احادیث پر بھی عمل ہو جاتا ہے جن میں انصات کا حکم آیا ہے۔

ہیں جس سے عام مسلمان زندگی کے مشکلات و مصائب میں بارگاہ خداوندی میں رجوع ہونے کے بجائے مختلف چوکھٹوں پر سر نیاز خم کرنے لگ گئے ہیں اور ان کو واذا سألك عبادی عنی فانی قریب پر عملاً بالکل یقین نہیں رہ گیا ہے۔

اس مسئلہ وسیلہ کی خامیوں پر سب سے پہلے غالباً امام ابن تیمیہ نے قلم اٹھایا، اور اس کو شریعت کی روشنی میں منقح کیا۔ ان کے مسلک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وسیلہ پکڑنا صحیح نہیں تھا۔ لیکن بعض دیگر ائمہ کی طرح شاہ عبدالرحیم صاحب نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وسیلہ کو جائز رکھا ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور سے وسیلہ کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

> و ہرچہ مشکل افتد مدد از روحانیت حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم باید خواست و از غیر حبیب خدا کسے دیگر رجوع نباید کرد۔ (مکتوبات ص ۴۸)

عرس و سماع عمل بالحدیث کے جذبہ کے باوجود شاہ صاحب کبھی کبھی عرس اور سماع میں بھی شرکت کر لیا کرتے تھے[1] لیکن ناجائز اغراض کے لیے جو لوگ ختم خواجگان وغیرہ پڑھتے تھے۔ اسے وہ ناپسند کرتے تھے۔[2]

اخلاق و عادات شاہ صاحب اخلاق و عادات میں اسلاف کی یادگار تھے۔ مزاج میں سادگی اور طبیعت میں صفائی اور بے تکلفی تھی۔ نشست و برخاست، گفتگو و ملاقات، تربیت و تنبیہ، لین دین، خرید و فروخت، تواضع و خاکساری، امداد و اعانت، غرض اپنی زندگی کے ہر کام میں وہ نمونۂ عمل

---

[1] انفاس ص ۷۴ [2] انفاس ص

تھے، اور ان کا کوئی کام، حکمت، ادائے سنت، یا خدمت خلق کے جذبہ سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ:

کار عاقلاں وحکیماں آنست کہ استیفائے لذت فقط مقصود نباشد بلکہ باید کہ آں در ضمن دفع حاجتے یا اقامت فضیلتے یا ادائے سنت واقع شود (انفاس۔ ۸۵)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کسی شخص کو سنت یا تعامل کے خلاف کوئی کام کرتے دیکھتے تھے تو بڑی نرمی اور شفقت سے منع کرتے تھے۔ انفاس میں ہے:

اگر نصیحت می خواستند نہایت رفق ولین ادامی نمودند۔ (ص ۸۵)

جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کی نصیحت لوگوں پر بہت جلد اثر انداز ہو جاتی تھی۔

آپ کے ایک ملنے والے کو جو علم وفضل سے بھی بہرہ ور تھے، فضول گوئی کی عادت تھی، شاہ صاحب نے ایک دن ان سے بڑی شفقت سے فرمایا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت وتعلق چاہتے ہو تو اس عادت کو ترک کردو، ورنہ اس دربار سے فیض نہیں پہنچ سکتا، آپ کی یہ بات ان کے دل میں گھر کر گئی اور انھوں نے وہ عادت چھوڑ دی۔

اگر کسی کو نیک بات کی تلقین کرتے تو اس میں ملائمت کے ساتھ ساتھ مخاطب کی صلاحیت کو بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

امر معروف ونہی منکر ومسائل خصوصہ بشرط ظن قبول برفق می کردند۔

(ص ۸۵)

عام فائدہ کے لیے جمعہ کے دن وعظ بھی فرمایا کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب

نے لکھا ہے کہ اس میں آپ بھی شرکت کرتے تھے[1]۔ زیادہ تر مشکوٰۃ، تنبیہ الغافلین، غنیۃ الطالبین اور آخر میں تفسیری وعظ کا معمول تھا[2]۔

آپ کے احباب ملنے آتے، تو رخصت کرتے وقت ان کے سامنے یہ شعر بطور وصیت پڑھا کرتے تھے۔

آسایش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

خانہ داری کی ضروری خرید و فروخت خود کرتے باوجود تنگی کے زندگی بھر کبھی قرض نہیں لیا۔ اور تعیش و تنعم کے لیے جو لوگ قرض لیتے تھے، ان کو بے حد ناپسند کرتے تھے، اور اس سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے[3]۔ کھانے پینے میں مشتبہات سے بھی گریز کرتے تھے۔ ایک مرتبہ رمضان میں ان کے استاذ مرزا زاہد نے ان کی دعوت کی۔ اتفاق سے اس وقت ایک کبابی آیا۔ اسے مرزا صاحب سے کچھ کام تھا جس کے لیے اس نے کباب کا ایک خوان بطور نذر کے پیش کیا۔ مرزا صاحب قبول نہیں کرتے تھے لیکن جب اس نے بہت اصرار کیا تو ایک شاگرد سے کہا کہ قیمت لگا کر اسے رکھ لو۔ شاگرد نے کئی روپے کے کبابوں کی قیمت کم لگائی اور کبابی راضی ہو گیا۔ شاہ صاحب نے مرزا صاحب سے آہستہ سے کہا کہ آپ رشوت سے بچنا چاہتے ہیں مگر کئی روپے کے کباب کم میں دینا علت سے خالی نہیں ہے۔ اگر غرض نہ ہوتی تو وہ کبھی راضی نہ ہوتا۔ شاہ صاحب کے اس کہنے سے مرزا صاحب نے شاگرد کو بلوا کر ڈانٹا، اور کبابوں کی پوری قیمت دلوائی[4]۔ اس کے بعد ان

---

[1] انفاس ص ۵۰ [2] انفاس ص ۲۹ [3] انفاس ۸۶ [4] انفاس ۴۳

کتابوں سے افطار کیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان کے اخلاق و عادات کے متعلق جستہ جستہ بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک جگہ جامع طور پر لکھتے ہیں:

حضرت ایشاں با اخلاق سلیمہ مرضیہ از شجاعت و فراست وکفایت و غیرت بدرجۂ اتم متصف بودند، عقل معاش مثل عقل معاد کامل و وافر داشتند و در ہر امر توسط دوست می داشتند۔

(انفاس ص ۸۵)

شاہی دربار اور امراء سے احتراز

شاہ صاحب امراء اور سلاطین سے ہمیشہ محترز رہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ والد صاحب نے امراء کے پاس جانے اور ان سے ملاقات کرنے کی رسم بالکل اٹھا دی تھی۔ لیکن اگر ان میں سے خود کوئی آجاتا تھا، تو اس سے وہ کج خلقی بھی نہیں برتتے تھے، بلکہ اعزاز و اکرام سے پیش آتے تھے۔ اور اگر وہ نصیحت کی خواہش کرتے تھے تو نہایت ہی رفق و تلطف سے دو چار کلمۂ خیر کہہ دیا کرتے تھے۔ (انفاس ص ۸۵)

اوپر ذکر آچکا ہے کہ فتاویٰ کی تالیف کے سلسلہ میں شاہی ملازمت کو کس کشمکش کے بعد قبول کیا تھا۔ اور جب اس سے تعلق منقطع ہوا، تو کس قدر مسرور ہوئے، اور شکرانہ ادا کیا، اور اس کے بعد جب شاہ عالمگیر نے زمین دینی چاہی تو اسے بھی قبول نہیں کیا۔

عالمگیر ہی کا ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کے ماننے والوں میں ایک صاحب عالمگیر کے درباری تھے۔ انہوں نے کسی موقع سے اس کے سامنے شاہ صاحب کے فضائل و مناقب کا ذکر کیا۔ عالمگیر نے ان سے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا۔ انہوں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ:

بخانۂ ملوک واغنیاء رفتن طریقۂ ایشاں نیست ۔ (انفاس ص ۶۹)

عالمگیر نے شاہ صاحب کے ایک دوسرے مخلص کے ذریعہ ملاقات کا پیغام بھیجا۔ لیکن شاہ صاحب نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔ ہر چند انہوں نے اصرار کیا، مگر شاہ صاحب کسی طرح راضی نہ ہوئے، مگر جب وہ بالکل مایوس ہو گئے، تو شاہ صاحب سے عرض کیا، کم از کم آپ ایک رقعہ ہی لکھ دیجیئے تاکہ کوتاہی نہ سمجھی جائے، شاہ صاحب نے ایک کاغذ جس میں آپ کا جوتا لپٹا ہوا رکھا تھا، لیا اور اس پر یہ عبارت لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دی۔

اجماع اہل دل است ہر آنکہ بئس الفقیر علی باب الامیر و حق سبحانہ می فرماید وما متاع الحیٰوۃ الدنیا الا قلیل جز اقل بشما رسید واگر بالفرض بمن خواہید و او جزء لایتجزیٰ خواہد بود برائے ایں جزء لایتجزیٰ نام خود را از دیوانِ خدائے تعالےٰ چرا بر آرم زیرا کہ در بعض ملفوظات بزرگان چشتیہ مذکور است کہ ہر کہ نام او در دیوان بادشاہ نوشتہ شد، نام اورا از دیوان حق سبحانہ بر می آرند[1]۔

یہ خط اس بادشاہ کو لکھا گیا ہے، جو شاہان تیموریہ میں سب سے زیادہ دیندار اور مذہب کا دلدادہ تھا۔ اور جس کے ذریعہ "فتاویٰ عالمگیری" جیسا دینی اور اہم کام انجام پایا تھا۔ عالمگیر نے اس رقعہ کی یہ قدر دانی کی کہ اسے جیب میں رکھ لیا اور جب کپڑے بدلتا تو اسے پھر دوسرے جوڑے کی جیب میں رکھ لیتا یہاں تک کہ وہ رقعہ گل کر ضائع ہو گیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ عالمگیر کے

---

[1] انفاس العارفین ص ۶۹۔ شاہ صاحب کے مکتوبات میں یہ خط کچھ تغیر الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

ہوئے عظیم الشان نے ملاقات کی خواہش کی، اور شاہ صاحب کے پاس لکھ بھیجا کہ "اگر آپ خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کے لیے تشریف لے جاتے تو اس بہانہ سے مجھے بھی شرف نیاز حاصل ہو جاتا۔" شاہ صاحب نے جواب میں لکھ بھیجا کہ:

ان اللہ لا ینظر الی صورکم واعمالکم وانما ینظر الی قلوبکم ونیاتکم۔

اللہ صورت اور اعمال کی طرف نہیں دیکھتا، اس کی نگاہ قلوب اور نیتوں پر پڑتی ہے۔

یا مثال ایں امور فریفتہ نمی شوم۔

میں اس قسم کی چیزوں پر فریفتہ نہیں ہوتا۔

شاہ صاحب کے زمانہ (۱۰۵۴ھ۔۱۱۳۱ھ) میں بڑے سیاسی انقلابات ہوئے، اور کئی سلاطین بدلے، جنہوں نے دعا و برکت کے بہانہ شاہ صاحب کی حمایت و ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر آپ نے ہمیشہ گریز کیا، اور ان معاملات سے بہت کم دلچسپی لی۔

جب معز الدین جہاندار شاہ پر فرخ سیر نے چڑھائی کی، تو معز الدین نے دعائے فتح کے لیے شاہ صاحب کی خدمت میں آنا چاہا، لیکن آپ نے اپنے درباری احباب کے ذریعہ یہ کہلا کر اسے روک دیا کہ:

"اس کا آنا مناسب نہیں، اس لیے کہ اگر سچ بولوں گا تو وہ ناخوش ہوگا، اگر جھوٹ بولوں تو فقیروں کا یہ شیوہ نہیں ہے۔"[1]

اسی طرح فرخ سیر اور سادات بارہہ میں ان بن ہوئی، تو شاہ صاحب کے

---

[1] انفاس ص ۶۴

سامنے بھی یہ جھگڑا پیش ہوا، آپ نے صرف اتنا فرمایا کہ "برائے من ایں راہم چنیں بگزارید" یعنی میری خاطر اس بادشاہ (فرخ سیر) کو اس کے حال میں چھوڑ دو۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان ہے کہ والد صاحب جب تک زندہ رہے فرخ سیر پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ لیکن ان کی وفات کے پچاس ہی دن کے بعد فرخ سیر کی بساط حکومت الٹ دی گئی اور وہ قید کر لیا گیا[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو شاہ صاحب فرخ سیر کو کسی حد تک پسند کرتے تھے یا اس کے بعد جو فتنہ وفساد شروع ہونے والا تھا، اسے اپنی زندگی میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

عبادت اور ذکر واشغال

ذکر وفکر، طاعت وعبادت، صلاح وتقویٰ کے اعتبار سے شاہ صاحب کی زندگی نمونہ تھی،

انہوں نے فرائض کے علاوہ نوافل ومستحبات میں بھی اپنا جو معمول بنا لیا تھا، ان پر ہمیشہ مستقیم رہے، اور عذر شرعی کے علاوہ انہیں کبھی ترک نہیں کیا، ان کی زندگی کا اصول تھا، کہ الاستقامۃ خیر من الکرامۃ (احکام الٰہی پر)" استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے" انہوں نے شیخ محمد جیو کو ایک خط میں لکھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے پانچ چیزیں[2] عطا کی ہیں، تم بھی ان پر قائم رہو، ان میں سے ایک یہ ہے کہ الذکر والتقویٰ علی کل حال یعنی ہر حال میں ذکر وتقویٰ پر استقامت، اس لیے آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ ذکر وتقویٰ پر استقامت سے خالی نہیں تھا۔ ذیل کے واقعات سے ان کا اندازہ ہو سکے گا۔

ہمیشہ نماز باجماعت پڑھتے تھے، عذر شرعی کے علاوہ کبھی اسے ترک نہیں

---

[1] ایضاً [2] وہ پانچ چیزیں یہ ہیں الذکر والتقویٰ علی کل حال وایصال النفع للخلق من غیر تفرقۃ وعدم
(باقی ص پر)

کیا۔ نماز کی پابندی کا یہ حال تھا، کہ جس شب آپ کا انتقال ہوا، تو نفس یاز پسین سے کچھ دیر پہلے دریافت کیا، صبح صادق ہوئی یا نہیں۔ حاضرین نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا کہ میرا رُخ قبلہ کی طرف کردو، لوگوں نے اس کی تعمیل کی۔ اور آپ نے اشارہ سے نماز ادا کی۔ اسی طرح وفات سے چند مہینے پہلے رمضان کا مہینہ آگیا۔ آپ بتقاضائے عمر اور علالت کی وجہ سے کمزور ہو چکے تھے۔ اور آپ کے لیے شرعی رخصت بھی موجود تھی لیکن آپ نے اس سے فائدہ اُٹھانا گوارا نہ کیا، اور پورے روزے رکھے۔ آپ کے اہلِ خانہ نے افطار کے لیے اصرار کیا، تو فرمایا کہ "بس یہی تو ہوتا ہے کہ کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہوجاتا ہوں، تو یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بے ہوش رہنے کا عادی ہو چکا ہوں[1]۔ شاہ صاحب کے خاص خاص معمولات یہ تھے۔

تہجد، اشراق اور چاشت کا خاص اہتمام تھا، لیکن تہجد میں رکعتوں کی تعیین نہیں تھی۔ بلکہ حضور ذہن اور نشاط کے ساتھ جتنی رکعتیں ہو جایا کرتی تھیں پڑھ لیا کرتے تھے۔ نماز مغرب کے بعد نفل والدین اور اپنے بڑے بھائی کے ایصال ثواب کے لیے پڑھتے تھے۔

تلاوت قرآن روزانہ کا معمول تھا۔ اور اسے بڑی خوش الحانی، سوز و گداز

(بقیہ حاشیہ) تفضیل نفسہ علی احد من الخلق والتواضع لامر اللہ و بخلق اللہ۔ ہر حالت میں ذکر و تقویٰ (مومن و کافر حیوان و انسان کی تفریق کے بغیر مخلوق کی نفع رسانی اور اپنے نفس کو افضل نہ سمجھنا اور خدا کے حکم کے آگے جھکنا اور اس کی مخلوق سے تواضع کے ساتھ پیش آنا۔

[1] انفاس العارفین اور انفاس رحیمیہ۔

اور تجوید کے ساتھ پڑھتے تھے۔ دن میں ایک ہزار بار درود شریف اور ایک ہزار نفی اثبات، بارہ ہزار مرتبہ اسم ذات کا ورد کرتے تھے۔ اور گیارہ بار سورۂ مزمّل اور گیارہ سو بار یا مغنی غناء ظاہری کے لیے پڑھتے تھے۔ درود سے خاص عشق تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ:

ہرچہ یافتیم بدولت درود مجرد یافتیم (انفاس ص ۸۶)

حکیمانہ مقولے

شاہ صاحب کے ملفوظات اور مکتوبات میں سینکڑوں حکیمانہ جواہر پارے بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم ان میں سے چند جن کا معاملات سے تعلق ہے نقل کرتے ہیں، آداب مجلس کے متعلق فرماتے تھے کہ:

در مجلس ہرگز نکوہش قومے مکن مگو کہ اہل یورپ چنیں اند و اہل پنجاب چنیں و افغاناں چنیں۔ شاید دراں میاں مردے باشد ازاں قوم یا از اہل حمیت آں قوم بدبردہ صحبت منغض شود۔

عام مجلس میں کسی خاص قوم کو ملامت نہ کرو، یہ نہ کہو کہ اہل یورپ ایسے ہیں، اور اہل پنجاب ایسے ہیں اور افغان اس طرح کے ہیں، ممکن ہے کہ اس قوم کا کوئی آدمی یا کوئی اہل غیرت شخص موجود ہو، اور وہ برا مانے اور مجلس میں بے لطفی پیدا ہو۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ:

ہرگز سخنے مخالف جمہور در مجلس عام بزبان میار اگرچہ فی نفسہ صحیح باشد کہ ایشاں بر آں انکار کنند و صحبت منغض شود۔

جو بات جمہور کے خلاف ہو، اسے ہرگز مجلس عام میں نہ کہو، اگرچہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ لوگ ردو قدح کریں گے اور مجلس میں تکدر پیدا ہوگا۔

فرمایا :

[illegible]

[illegible]

فرمایا :

[illegible] نعمت [illegible] پیشاں [illegible] شکر آں بجا [illegible] پیشاں بسیار شود [illegible] نزدیک تو ہیچ قدر ندارد در چشم ایشاں عظیم نماید۔

جو کچھ تم سے [illegible] کو خدائی نعمت سمجھو اور اس پر اس کا شکر ادا کرو، اور ان سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آؤ اور ان کی مزاج پرسی کرو، اس لیے کہ بسا اوقات ایک ادنیٰ التفات جس کی تمہارے نزدیک کوئی قیمت نہیں ہے، ان کے نزدیک اس کی بڑی عظمت ہوتی ہے۔

و اگر آں را نیابند محزوں شوند۔

اور اگر وہ تمہاری طرف سے یہ ادنیٰ التفات نہ پائیں گے تو رنجیدہ ہوں گے۔

فرمایا کہ :

اگر ترا با کسے حاجتے باشد بر وتمہید شایستہ کن و تدریج نما در طلب آں حاجت و نباید کہ سخن مثل سنگ اندازی۔

اگر تم کو کسی سے کوئی ضرورت پیش آجائے تو عمدہ پیرائے اور تدریجی طور سے ان کا اظہار کرو۔ یہ نہ ہو کہ بات پتھر کی طرح مارو۔

والدین کی خدمت کے بارے میں فرمایا: لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل کام ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت آسان ہے اس لیے کہ:

ایشاں بادنی خاطر جوئی رضا مندمی شوند و اند کے را بسبب غایت شفقت بسیارے شمردند۔

والدین تھوڑی سی دلجوئی سے بھی راضی ہو جاتے ہیں، اور غلبۂ شفقت کی وجہ سے تھوڑی خدمت کو بھی بہت سمجھتے ہیں۔

در مخاطبہ بزرگاں سخن مغلق و موجز و آہستہ گفتن روا نیست۔

بڑوں سے گفتگو کرنے میں مغلق، مختصر اور آہستہ بات نہیں کرنا چاہیئے۔

در سخن گفتن و راہ رفتن و نشستن و برخاستن برسم اقویا و عادت ایشاں کارکن اگرچہ ضعیف باشی۔

بات چیت کرتے، راستہ چلنے اور نشست و برخاست میں قوی لوگوں کی عادت اختیار کرو، خواہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔

وضع اور لباس کے متعلق فرماتے ہیں:

باید کہ لباس و زی مرد مشعر باشد بصفت کمال وے مثلاً کسے کہ دانشمند است باید لباس دانشمنداں پوشد بہ آئین ایشاں زندگانی کند و آنکہ فقیر است باید لباس فقیراں پوشد و بہ آئین ایشاں زندگانی کند۔

آدمی کا لباس اور اس کی وضع ایسی ہونی چاہیئے کہ اس سے اس کے صفت کمال کا پتہ چل جائے مثلاً اگر کوئی فقیہہ یا فلسفی ہے تو اس

کو انہیں جیسا لباس پہننا چاہیئے، اور انہیں جیسی زندگی گذارنی چاہیئے، اگر کوئی درویش ہے، تو اسے اہلِ فقر ہی جیسا لباس اور انہیں جیسا رہن سہن اختیار کرنا چاہیئے۔

اولاد شاہ صاحب کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی زوجہ کے متعلق یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس کی صاحبزادی اور کس خاندان سے تھیں، ان کے بطن سے ایک صاحبزادے صلاح الدین پیدا ہوئے۔ جب شاہ صاحب کا سن ساٹھ برس کا ہوا تو بعض غیبی[1] بشارتوں کی بنا پر انہوں نے دوسری شادی محمد پھلتی[2] کی صاحبزادی سے کی، ان نیک[3] بخت خاتون کے بطن سے دو صاحبزادے شاہ ولی اللہ اور

---

[1] اس غیبی بشارت کا تذکرہ شاہ ولی اللہ صاحب نے انفاس العارفین میں دو جگہ کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "برایشاں منکشف ساختند تقدیر براں جاری شد کہ ایشاں را فرزند دیگر موجود آید ...... وآں مولود فلاں وفلاں مقام خواہد رسید داعیہ تزوج بخاطر ایشاں پیدا شد۔" (ص ۶۳)

دوسری جگہ خود شاہ عبدالرحیم کی زبانی فرماتے ہیں "می فرمودند دیگر بار بزیارت مرقد منور ایشاں (بختیار کاکی) رفتم روح ایشاں ظاہر شد، فرمودند ترا پسرے پیدا خواہد شد اورا قطب الدین احمد نام کن ..... بعد از زمانے داعیہ تزوج دیگر پیدا شد" (ص ۴۴)

[2] شیخ محمد کے اجداد سدھور (بہار) کے رہنے والے تھے، ان کے اجداد میں شیخ احمد نے سکندر لودھی کے دربار میں رسوخ حاصل کیا، جس سے [illegible] سلطنت کے قریب کچھ زمین مل گئی، اور وہ سدھور سے پھلت آگئے، یہ خاندان دنیا [illegible] ہت کے ساتھ ساتھ علم وفضل میں ممتاز تھا، خود شیخ محمد بڑے برگزیدہ اور ممتاز [illegible] تھے

[3] ربانی صـ [illegible]

شاہ اہل اللہ[۱] پیدا ہوئے اور ہندوستان میں اسلامی علوم و عرفان کے سرچشمہ بنے۔

۷۔ ملا ابوالوعظ برگامی

ملا ابوالوعظ مولانا فضل حق خیرآبادی کے پردادا بھائی تھے، ان کا سلسلۂ نسب بارہویں پشت پر شاہ عبدالرحیم صاحب سے مل جاتا ہے، اور یہ حسن اتفاق ہے، کہ اس خاندان کے یہ دونوں گوہر شب چراغ فتاویٰ کی تالیف میں شریک تھے۔

نام و نسب ابوالوعظ نام یا کنیت تھی، ان کے والد کا نام قاضی صدرالدین تھا، نانہالی سلسلۂ نسب کا تو علم نہیں ہو سکا، دادیہالی شجرۂ نسب حضرت فاروق اعظمؓ تک منتہی ہوتا ہے، پورا شجرہ یہ ہے:

ابوالوعظ بن قاضی صدرالدین قاضی اسماعیل برگامی بن قاضی عمادالدین بدایونی

(بقیہ حاشیہ) شاہ ولی اللہ صاحب کی والدہ ایک رابعہ صفت اور مریم فطرت خاتون تھیں، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان کی نسبت توجہ کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ انہوں نے بیس عورتوں کو بیک وقت توجہ دی (ص ۶۶) ان کی عبادت و ریاضت کے اور بھی واقعات انفاس العارفین میں ہیں۔

[۱] شاہ اہل اللہ بھی علم و فضل اور تصوف میں خاندانی روایات کے حامل تھے۔ انہوں نے شاہ عبدالرحیم صاحب کے مکتوبات کو انفاس رحیمیہ کے نام سے جمع کیا ہے، کتاب کے شروع میں چند سطریں انہوں نے بھی اخلاقیات پر لکھی ہیں، جن سے ان کی عظمت اور ولایت کا پتہ چلتا ہے۔

بن شیخ ارزانی بن شیخ منور بن خطیر الملک بن شیخ سالار شام بن شیخ وجیہہ الملک بن شیخ بہاء الدین بن شیر الملک، شیر الملک کے اوپر ایک دو نام میں اختلاف[1] کے علاوہ پورا شجرہ وہی ہے، جو شاہ عبدالرحیم صاحب کے حالات میں درج ہو چکا ہے۔ شیر الملک کے دو صاحبزادے شمس الدین اور بہاء الدینؒ تھے، اور دونوں صاحب علم و فضل اور صاحب وجاہت تھے، اور دونوں ساتھ ہی ہندوستان آئے۔[2]

شیخ شمس الدین رہتک کے قاضی ہوئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ اور شیخ بہاء الدین بدایوں کے قاضی ہوئے اور وہیں متوطن ہو گئے۔ ان کی اولاد میں شیخ عماد الدین کی شادی قاضی برگام (سیتا پور) کی صاحبزادی سے ہوئی۔ قاضی صاحب کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اس لیے ان کے بعد قاضی عماد الدین ہی برگام کے قاضی مقرر ہوئے۔ اور اس سلسلہ سے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کے بعد ان ہی کے صاحبزادے قاضی صدر الدین یعنی ملا ابوالوعظ کے والد نے ان کی جانشینی کی۔ قاضی صدر الدین کے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادیوں کی شادی گوپامئو اور لاہرپور وغیرہ میں ہوئی تھی۔ صاحبزادوں میں ایک ملا عبدالماجد ہیں، جن کی اولاد میں کئی متبحر اور ممتاز عالم گذرے ہیں، مولانا فضل حق خیر آبادی بھی ان ہی کی اولاد میں تھے۔ دوسرے صاحبزادے ملا ابوالوعظ ہیں، جنھوں نے غالباً عہدۂ قضا کے بجائے درس و تدریس کو اپنا مشغلہ بنایا۔

ملا ابوالوعظ اپنے وقت کے مشاہیر علما میں تھے، اور عالمگیر کے اتالیق بھی

---

[1] باغی ہندوستان میں ملا ابوالوعظ کا جو شجرہ درج ہے، اس میں شیر الملک کے اوپر دو ایک نام شاہ ولی اللہ صاحب کے انفاس العارفین میں دیئے ہوئے شجرہ سے مختلف ہیں۔

[2] باغی ہندوستان ص ۱۲

رہ چکے تھے ۔مگر عام تذکروں میں ان کے حالات نہیں ملتے ۔ مولانا فضل حق خیرابادی کے والد مولانا فضل امام صاحب (متوفی ۱۲۴۴ھ) نے اپنی کتاب آمد نامہ[1] میں قصبہ برگام کے علماء کے کچھ حالات لکھے ہیں ، جس کے کچھ اقتباسات ایک کرم فرما[2] کے ذریعے مل گئے ہیں ۔ اسی سے ان کے حالات لکھے جاتے ہیں ۔

درس و تدریس ملا ابوالوعظ کا محبوب مشغلہ درس و تدریس تھا ، ان کے درس میں دُور دُور سے طلبہ اور علماء آکر شریک ہوتے تھے ۔

مولانا فضل امام صاحب نے لکھا ہے کہ :

ملا محب اللہ بہاری صاحب سلم ملا ابوالوعظ سے درس لینے کے لیے گئے تھے مگر ان کا کوئی وقت خالی نہیں تھا ، اس لیے مایوس ہوکر ملا قطب الدین سہالوی کے پاس گئے ، اور اس چشمۂ علم سے اپنی علمی تشنگی بجھائی ۔

آمد نامہ میں ایک دوسرا واقعہ ملا قطب الدین سہالوی کا یہ درج ہے کہ :

ملا قطب الدین سہالوی ملا ابوالوعظ کے پاس علمی بحث و مباحثہ کی غرض سے برگام پہنچے ، لیکن ملا ابوالوعظ نے اس سے گریز کیا اور ان سے فرمایا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں ، تم نوجوان ہو ، اگر مباحثہ میں مجھ پر کوئی اعتراض وارد ہوا ، جس کا میں جواب نہ دے سکا ، تو میرے

---

[1] یہ کتاب کچھ فارسی قواعد اور چند علماء کے حالات پر مشتمل ہے ، قصبہ برگام میں یہ کتاب قلمی موجود ہے ، اس کے کچھ اقتباس سید نجم الحسن صاحب نے بھیجے ہیں ، یہ حالات انہی سے ماخوذ ہیں ۔

[2] گو یہ اقتباس برگام سے سید نجم الحسن صاحب نے بھیجا ہے ، مگر اس کا اصل ذریعہ جناب عبدالشاہد خانصاحب شروانی مترجم الثورۃ الہندیہ ہیں جنھوں نے اصرار کر کے اسے بھجوایا ۔

مرنے کے دن قریب آئے ہیں، درس و تدریس تک کا ہوش نہیں۔
اس لیے مجھے کوئی ندامت نہ ہوگی اور نہ دوسروں کا کوئی نقصان ہوگا، لیکن
اگر آپ کے ساتھ یہ بات پیش آجائے گی۔ تو پھر طلبہ کے دل سے آپ
کا وقار جاتا رہے گا، اور جو آپ کی ذات سے دوسروں کو فیض پہنچ
رہا ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔
ملا قطب الدین نے عرض کیا کہ:

مرا داعیہ تلمذ است نہ داعیہ برابری اگر استفادہ خواہم کرد
کتاب درمیان خواہم نہاد۔

اس کے بعد کئی روز تک دونوں بزرگوں کی پر خلوص صحبت رہی۔
ملا ابو الوعظ عالمگیر کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ آمد نامہ میں ہے:
از استاذان عالمگیر بادشاہ اند۔

وفات آپ نے ہرگام میں پوری زندگی بسر کی، اور وہیں وفات پائی، تاریخ وفات
اور اولاد و اخلاف کی تصریح نہیں مل سکی۔

علم و فضل مولانا فضل امام ان کے علم و فضل کے متعلق لکھتے ہیں:
ملا ابو الوعظ ہرگامی از اساطین علماء و اراکین فضلا بودہ در
جمیع علوم دستگاہے بلند و قدرتے تمام داشت۔

ملا ابو الوعظ کو باطنی ذوق سے بھی حصہ ملا تھا۔ آمد نامہ میں ہے:
خوارق عادات و کمالات باطنی ملا بسیار نقل کنند۔

علمی یادگاریں انہوں نے بہت سی علمی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان میں ہدایہ،
مطول، اور ملا جلال کے حواشی خاص اہمیت رکھتے ہیں، ملا جلال
کے حواشی کے متعلق مولانا فضل امام صاحب لکھتے ہیں کہ:

دیدہ ام بغایت متین نوشتہ بودند و ازاں حاشیہ مبلغ علم ملا معلومی شد۔

ایک رسالہ جملہ خبریہ کے متعلق بھی لکھا تھا، اس کے متعلق مولانا فضل امام صاحب فرماتے ہیں:

الحق نہایت خوب است و مرتبہ متین است۔

لیکن زمانہ کی دستبرد سے ان کی اکثر کتابیں ضائع ہوگئیں مولانا فضل امام صاحب ان کتابوں کے ناپید ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

و زماں از ملا نشانے یافتہ نمی شود اطارت بہا العنقا ام غاب بہا العقل۔

فتاویٰ میں شرکت

ان سب کے علاوہ ملا ابوالوعظ کا سب سے بڑا کارنامہ اور ان کی قیمتی یادگار فتاویٰ عالمگیری کی تالیف میں شرکت ہے، آمد نامہ میں ہے:

تالیف فتاویٰ عالمگیری شرکت داشتند۔

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس حصہ کی تالیف ان کے سپرد تھی، اور یہ نہ پتہ چل سکا کہ وہ کسی کے معاون کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، یا وہ خود کسی حصہ کے ذمہ دار تھے۔

ایک ضروری بات

فتاویٰ عالمگیری کے چند اور جامعین کے حالات یا نام بعض حال کے اردو تذکروں میں مل گئے ہیں۔ اگرچہ کسی قدیم تذکرہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی، لیکن اس خیال سے ان کے نام یا مختصر حالات کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے، تاکہ اصحاب علم میں کسی صاحب کو اگر ان کے صحیح حالات اور فتاویٰ کی تالیف میں ان کی شرکت کی تائید کسی قدیم ماخذ سے مل جائے، تو وہ

اس کو پیش کرسکیں۔

فتاویٰ کے مؤلفین کے ناموں کے ذکر کرنے میں زیادہ احتیاط اس وجہ سے کرنی پڑتی ہے، کہ اس کے جمع وترتیب کی نسبت بہت سے لوگوں کی طرف غلط مشہور ہوگئی ہے، اس غلطی کی وجہ ظاہر ہے کہ فتاویٰ عالمگیری، ہندوستان کے علماء کا ایک بڑا کارنامہ ہے، اس میں علماء کی ایک کثیر تعداد شریک تھی، اور وہ کام چونکہ کئی برس تک ہوتا رہا، اس لیے اشخاص میں ردو بدل بھی ہوتا رہا۔ اس بنا پر جن اشخاص یا جس خانوادہ علم کا فتاویٰ میں شرکت کے علاوہ علمی تعلق دربار عالمگیری سے تھا، ان کی طرف بھی نادانستہ طور پر، فتاویٰ کی تالیف کی نسبت کا ہو جانا چنداں تعجب خیز نہیں ہے۔ نیز جن لوگوں نے اپنے خاندانی بزرگوں کے حالات لکھے، انہوں نے بھی اپنے اجداد کو اس شرف میں شریک کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ ہر بڑے اور باعث امتیاز کاموں میں شرکت کی نسبت ہوتا ہے۔

یہ چند سطریں اس لیے لکھ دینا ضروری معلوم ہوا کہ مؤلفین فتاویٰ کی فہرست میں جو نام بھی داخل کیے جائیں۔ اس میں پوری احتیاط سے کام لیا جائے بہرحال ان کے نام یا مختصر حالات یہ ہیں۔

۸۔ ملا محمد غوث کاکوروی

محمد غوث نام، ابو محمد کنیت، اور وطن کاکوری تھا۔[۱]

۱۰۵۶ھ میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ مکتبی تعلیم کے بعد ملا محمد زماں، ملا ابوالواعظ اور ملا قطب الدین سہالوی سے عربی کی تکمیل کی۔[۲]

---

[۱] یہ بھی مؤلفین فتاویٰ میں ہیں۔
[۲] مشاہیر کاکوری صفحہ ۲۵۴

تکمیل کے بعد دلی چلے گئے۔ ان کے تبحر علمی نے دربار عالمگیری میں پہنچایا۔ عالمگیر ان کا بڑا اعزاز کرتا تھا، اور حدیث میں خاص طور سے اس نے ان سے استفادہ کیا تھا۔

مؤلف مشاہیر کاکوری کے مطابق ملا محمد غوث بارہ سال تک عالمگیر کے ساتھ دکن میں رہے۔

ملا غوث نے درس و تدریس کا مشغلہ بھی ہمیشہ جاری رکھا، اور بہت سے تشنگان علم کی پیاس بجھائی۔ ان کے مشہور تلامذہ میں شاہ محمد وارث، شیخ عبد اللہ بن شیخ امان اللہ اور مولوی غلام مرتضیٰ مؤلف جواہر الانشاء ہیں۔

۶۳ سال کی عمر میں ۲۶ صفر ۱۱۱۸ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی، صاحب مشاہیر کاکوری فتاویٰ میں ان کی شرکت کے متعلق لکھتے ہیں:

تبحر علمی نے شاہ عالمگیر کے دربار تک پہنچایا اور وہاں مجلس جامعین و مؤلفین فتاویٰ عالمگیری میں مقرر ہوئے۔" (ص ۳۵۴)

مؤلف نے اس کے ثبوت میں قاضی نجم الدین علی خاں (جو ملا غوث کے پوتے ہوتے ہیں) کی کتاب اشک ریاض سے ایک فارسی عبارت نقل کی ہے لیکن فتاویٰ کی تالیف میں شرکت کے متعلق کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے، اس لیے ان کو مؤلفین فتاویٰ میں شامل کرنے کے لیے مزید ثبوت اور تصدیق کی ضرورت ہے۔

نواب علی حسن خاں قاضی نجم الدین کے حالات میں لکھتے ہیں:

وجد بزرگوارش ملا محمد غوث فضائل پناہ و کمالات دستگاہ و در علم حدیث استاد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ بود۔ (گلشن)

لیکن انہوں نے بھی فتاویٰ کی شرکت کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔

۹۔ ملا سعید

ملا سعید ملا قطب الدین شہید سہالوی کے منجھلے صاحبزادے تھے تعلیم کی تکمیل اپنے والد ہی سے کی، اور عرصہ تک والد کے ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ رکھا، حضرت شہید کی شہادت کے بعد انہوں نے عالمگیر کے دربار سے تعلق قائم کیا۔ اور وہاں سے فرنگی محل کے قیام کی سرکاری سند ملنے کے بعد اہل و عیال سمیت سہال سے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔

ولادت و وفات کی تاریخ کی کوئی تصریح نہیں مل سکی، پسماندگان میں دو صاحبزادے احمد عبد الحق اور مولانا عبد العزیز یادگار چھوڑے۔

فتاویٰ کی تالیف کی شرکت کے بارے میں صاحب تذکرہ علمائے فرنگی محل نے لکھا ہے کہ:

مشہور ہے کہ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں ملا سعید بھی دوسرے علماء کے مانند شریک تھے۔ (ص ۶۴)

لیکن محض شہرت قطعی ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے۔

۱۰۔ علامہ ابو الفرح

حیات جلیل ص ۱۳ میں مذکور ہے۔

"امیر میراں علامہ ابو الفرح معروف بہ سید معدان جو فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب و تالیف میں دیگر علمائے عصر کے دست و بازو تھے۔

مؤلف نے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس لیے قطعی طور سے فتاویٰ کی تدوین ان کی شرکت کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

۱۱۔ ملا غلام محمد

برادر محترم مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی نے ایک خط میں ملا غلام محمد قاضی القضاۃ کے متعلق لکھا تھا، کہ وہ بھی مؤلفین فتاویٰ میں ہیں، اور انہوں نے ایک قلمی کتاب آثار اشرف کا حوالہ بھی دیا تھا لیکن کوشش کے باوجود وہ کتاب دستیاب نہیں ہو سکی، کتاب ملنے کے بعد اس کی مزید تفصیل پیش کی جا سکتی ہے۔

۱۲۔ چلپی عبداللہ

فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین کے سلسلہ میں ذکر آچکا ہے کہ انہوں نے اس کا فارسی ترجمہ کیا تھا اب ان کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

عبداللہ نام، چلپی غالباً لقب یا خاندانی نسبت تھی۔ شاہجہاں کے زمانہ میں روم[1] سے ہندوستان آئے۔ عربی، ترکی، فارسی وغیرہ متعدد زبانیں جانتے تھے[2] ان کو تصوف اور فن تصوف خصوصاً صوفیہ کی اصطلاحات وغیرہ سے پوری واقفیت تھی۔ تصوف وحکمت میں کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ فرحۃ الناظرین میں ہے :

> از علوم ظاہری و معارف باطنی بہرہ تمام داشت در مصطلحات طائفۂ عالیہ صوفیہ آگہی تمام حاصل نمودہ ..... در علوم تصوف وحکمت تو الیف رائقہ وتصانیف لائقہ دارد۔ (ص ۸۲)

---

[1] روم سے مراد ایشیائے کوچک کا علاقہ ہے۔

[2] فرحۃ الناظرین ص ۸۱

ملا سعد اللہ کو جو عالمگیر کے مقربین میں تھے، ان سے بڑا تعلق تھا، غالباً انہی کے ذریعہ دربار میں پہنچے، اور فتاویٰ عالمگیری کے فارسی ترجمہ کے لیے مامور ہوئے، اور اپنے چند شاگردوں کے ساتھ اس مبارک کام کو انجام دیا[1] نسخۃ الناظرین میں ہے:-

"وچلپی عبد اللہ بترجمۂ آں (فتاویٰ عالمگیری) مامور بود"[2]

صاحب مرآۃ العالم کو غالباً نام کے اشتراک سے دھوکا ہوا، اس نے چلپی عبد اللہ کو ملا عبد اللہ سمجھ کر مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی کا لڑکا اور فتاویٰ کا مترجم قرار دیا، اور ان کے نام کے آگے چلپی نسبت رہنے دی۔ حالانکہ چلپی کی نسبت ملا عبد الحکیم کے صاحبزادے کی طرف کسی طرح صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ یہ لفظ ترکی زبان میں کوئی لقب یا خاندانی نسبت کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جس کی طرف وہاں کے بہت سے علما منسوب ہیں۔ کشف الظنون کے مصنف بھی اسی نسبت سے چلپی مشہور ہیں، ہندوستان کے کسی عالم کی طرف اس نسبت کا کیا جانا قیاس میں نہیں آسکتا۔

اوپر ہم خود مرآۃ العالم ہی کی ایک دوسری عبارت نقل کر چکے ہیں کہ عبد اللہ چلپی اس کے مترجم تھے جو ترکی النسل تھے۔

ملا عبد اللہ کو مترجم قرار نہ دینے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مرآۃ العالم میں

---

[1] مرآۃ العالم قلمی نسخہ ۲۷۵

[2] قلمی نسخہ دار المصنفین نقل از نسخۂ خدا بخش خان لائبریری، پٹنہ

عالمگیر کی حکومت کے ابتدائی دس سال یعنی ۱۰۷۸ھ تک کے واقعات درج ہیں اور اس کے آٹھ برس بعد یعنی ۱۰۸۶ھ میں دربار سے ملا عبداللہ کا تعلق ہوا، اور فتاویٰ عالمگیری کا ترجمہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔[1] صاحب مآثر عالمگیری ۱۰۸۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے:

(مولوی عبداللہ) ہنوز ملازمت عالی سے سرفراز نہیں ہوئے تھے، قبلۂ عالم نے حسن ابدال سے ان کے نام پیام شوق روانہ فرمایا، کہ جہاں پناہ کے لاہور پہنچنے پر فاضل مذکور اپنے وطن سے روانہ ہو کر اس شہر میں بادشاہ کی ملازمت کا شرف حاصل کریں۔ مولوی عبداللہ لشکر شاہی کے ورود سے دو تین روز پیشتر ہی لاہور پہنچ گئے تھے۔ مولوی مذکور چند مرتبہ خدمت شاہی میں حاضر ہو کر صحبت فیض اثر سے بہرہ اندوز ہوئے۔ بادشاہ علم پرور نے فاضل سیالکوٹی کو خلعت خاص اور دو سو اشرفیاں نادہ فیل عطا فرما کر ان کو وطن جانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ (ص ۱۰۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فتاویٰ کے مترجم ملا عبداللہ سیالکوٹی نہیں، بلکہ چلپی عبداللہ ترکی تھے۔

۱۳۔ سید علی اکبر سعد اللہ خانی غالباً دلی کے باشندے تھے عقلی علوم میں انہیں کافی دستگاہ تھی، خصوصیت سے علم دانائی (فلسفہ) میں یکتائے روزگار تھے۔ فرحۃ الناظرین میں ہے۔

اکثر شعب دانش در زبدہ و غوامض ودقائق علوم آگہی داشت

---

[1] خود مرأۃ العالم کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۰۸۶ھ سے پہلے فتاویٰ کے ترجمہ کا کام شروع ہو چکا تھا۔

وسیما درفقہ۔ (ص ۸۳)

محبوب الالباب میں ہے۔

"در اکثر فنون مہارتے کامل داشت۔ علم فقہ نیک می دانست"۔

سعداللہ خاں کے خاص ہم نشینوں اور ہم جلیسوں میں تھے۔ ان کا زیادہ وقت سعداللہ خان ہی کے پاس گذرتا۔ اسی تعلق سے وہ سعداللہ خانی مشہور ہوگئے۔ سعداللہ کے ایک لڑکے لطیف اللہ خاں کی تعلیم وتربیت بھی ان ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ لطیف اللہ نے آپ کے فیض صحبت سے علوم میں اچھی خاصی استعداد پیدا کرلی تھی۔

غالباً سعداللہ خاں ہی کے واسطہ سے دربار شاہی میں رسائی ہوئی۔ اور فتاوی کی تالیف میں شریک کیے گئے۔ فرحۃ الناظرین میں ہے۔

بتالیف فتاوی عالمگیری مامور شدہ بعنایت خلعت رحمانی امتیاز داشت۔

(ص ۸۴)

مآثر عالمگیری نے ۱۰۹۰ھ کے واقعات کے ضمن میں سید علی اکبر قاضی کا ذکر کیا ہے۔ اگر یہی سید علی اکبر مولف فتاوی ہیں تو صاحب مآثر کے بیان کے مطابق وہ لاہور کے قاضی رہ چکے تھے۔ امیر قوام الدین ناظم لاہور کی سازش سے قتل ہوئے۔ ان کے قتل کا مقدمہ چلا۔ اس سلسلہ میں امیر قوام الدین کو لاہور کی نظامت سے برطرف کرکے عدالت شاہی میں لایا گیا۔ مگر ان کے صاحبزادے نے قوام الدین کے اعزہ اقارب کی سفارش سے قصاص معاف کردیا اور وہ رہا ہوگیا۔[۲]

اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک صاحبزادے بھی تھے۔

---

[۱] عالمگیر کے دربار کا مقبول آدمی تھا۔ مآثر الامراء میں اس کا تذکرہ موجود ہے، جملۃ الملک اس کا خطاب تھا۔ [۲] مآثر عالمگیری ص ۱۳۱

۱۴۔ سید نظام الدین ٹھٹوی شہر ٹھٹھہ (سندھ) اصلی وطن تھا، فقہ میں کافی دستگاہ تھی، اسی علم دانائی (فقہ) نے انہیں دربار شاہی میں پہنچایا، اور وہاں مختلف مناصب پر مامور ہوئے، اور دوسرے علماء کے ساتھ انہوں نے بھی فتاویٰ کی تالیف میں حصہ لیا۔ تذکرہ علمائے ہند کے علاوہ تحفۃ الکرام میں بھی ان کا ذکر ہے۔ اس کی عبارت حسب ذیل ہے:۔

سید نظام الدین ٹھٹوی در فقہ ادفق انام و در علوم اعلم کرام بر آمدہ بتدبیر ملی گرائیدہ سوئے شاہجہان آباد شتافتہ و در تالیف فتاویٰ عالمگیری سلسلہ مشکلات حل کردہ۔

(ص ۲۷۸ و تحفۃ الکرام ج ۲ ص ۲۵)

۱۵۔ قاضی ابوالخیر ٹھٹوی آپ شہر ٹھٹھہ (سندھ) کے باشندے تھے۔ آپ کی زندگی کے اور حالات معلوم نہ ہو سکے۔ تذکرہ علمائے ہند میں اتنا ہے کہ:

در فتاویٰ عالمگیری شریک استنباط مسائل بود۔

فتاویٰ عالمگیری میں استنباط مسائل میں شریک تھے۔

اس سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ فتاویٰ کی تالیف میں شریک اور استنباط مسائل اور ماخذ پر پوری نظر تھی۔ (تحفۃ الکرام ج ۳ ص ۲۱۸)

استنباط مسائل سے غالباً مراد یہ ہے کہ فقہائے احناف کے مختلف اقوال میں جو قول کتاب وسنت کے مطابق ہوتا اس کی وہ نشاندہی کر دیتے تھے اس سے ان کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔

۱۶۔ جلال الدین محمد مچھلی شہر ضلع جونپور کے باشندے تھے، آٹھ واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب قاضی ثناء الدین مچھلی شہری

سے جو اپنے وقت کے بڑے متبحر اور مزناض علماء میں تھے، مل جاتا ہے۔

آپ کو جملہ علوم میں دستگاہ تھی، خصوصیت سے فقہ و حدیث میں بہت ممتاز تھے، مشاہیر جونپور میں ہے:

در فقہ و حدیث بزمان او نظیرش نمی تواں یافت۔ (ص ۱۲۱)

درس و تدریس آپ کی زندگی کا عزیز ترین مشغلہ درس و تدریس تھا، ساری عمر آپ کا فیض جاری رہا، اور ہزاروں تشنگان علم اس چشمۂ علم سے سیراب ہوئے۔ مشاہیر جونپور میں ہے:

مشغلۂ درس و تدریس مادام الحیات مرعی داشت اکثرے فضلائے ایام یا و پیوستند و گلہائے فیض فراواں چیدند۔ (ص ۱۲۱)

عالمگیر کو جب آپ کے علم و فضل کی اطلاع ملی۔ تو بڑی نیاز مندی سے بلا کر شاہی دربار کے علماء میں شامل کیا۔

جب فتاویٰ عالمگیری کی تالیف کا کام شروع ہوا تو اس کے حصہ اول کی تالیف آپ کے سپرد ہوئی۔ مشاہیر جونپور میں ہے:

از تصنیفات و تالیفاتش فتاویٰ عالمگیری حصہ اول است کہ حسب الامر سلطانی جمع نمود۔ (ص ۱۲۲)

وفات: سنہ وفات کی کوئی تصریح نہیں مل سکی، آپ کے مدفن کے متعلق صاحب مشاہیر جونپور لکھتا ہے:

قبرش در قصبہ مچھلی شہر جانب جنوب بر سرحد موضع ادنیا پورہ است۔ (ص ۱۲۲)

۱۹۔ ملا حامد جونپوری حامد نام، جونپور وطن تھا، عنفوان شباب ہی میں دلی چلے گئے۔ وہاں شاہجہانی دربار کے مشہور عالم

مرزا محمد زاہد کابلی[1] کی خدمت میں پہنچے، عربی کی اکثر متداول کتابیں ان سے اور بعض کتابیں اسی عہد کے ایک اور صاحب علم و دانش منیر وقمان[2] سے پڑھیں، تکمیل علم کے بعد شاہی دربار کے ان علماء کے زمرہ میں لیے گئے، جن کو ڈیڑھ دو روپیہ یومیہ وظیفہ ملتا تھا[3]۔

شاہ جہان کے بعد جب عالمگیر سریر آرائے حکومت ہوا تو اس نے بھی دربار کے تعلق اور مناصب کو برقرار رکھا۔ شاہزادہ اکبر جب سن شعور کو پہنچا تو اس کی تعلیم وتربیت انہی کے سپرد ہوئی۔ اور فتاویٰ کی تالیف کے لیے ان کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ تذکرہ علمائے ہند میں ہے۔

در عہد عالمگیر داخل مولفین فتاویٰ شد (ص ۴۴)

ارباب تذکرہ نے زمانۂ وفات وغیرہ کی کوئی تصریح نہیں کی ہے اور نہ ہی فتاویٰ کے علاوہ کسی دوسری علمی یادگار کا کوئی علم ہے[4]۔

(تحفۃ الکرام ج ۲ ص ۴۴)

---

[1] منطق میں میرزاہد ان ہی کی تصنیف ہے [2] وزیر امور ممالک غیر تھے [3] فرحۃ الناظرین تذکرہ علمائے ہند [4] صاحب مشاہیر جونپور نے بھی ملا حامد نام کے ایک عالم کا تذکرہ کیا ہے، مگر سنہ وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق وہ آخر عمر میں دلی سے جونپور واپس چلے آئے، اور وہیں وفات پائی۔ انھوں نے ایک بہت وسیع اور پختہ مسجد بنوائی تھی۔ اسی کے قریب وہ دفن ہوئے۔ جونپور کا ایک محلہ بھی ان کے نام سے مشہور ہے۔ شاید یہ محلہ ملا ٹولہ ہو۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی لکھتا ہے کہ شاہ عالم کے زمانہ میں دلی گئے اور شاہزادہ اکبر کی تعلیم ان کے سپرد ہوئی۔ اگر یہ بیان صحیح ہے اور اکبر سے مراد شاہ عالم ثانی کا لڑکا اکبر ہے، تو یہ ملا حامد دوسرے تھے۔ اور اگر اس سے مراد عالمگیر کا لڑکا اکبر ہے۔ تو پھر یہ دونوں ایک ہی

(بقیہ ص ۔۔۔ پر)

۱۸۔ شیخ رضی الدین بھاگل پور (بہار) کے ایک شریف خاندان سے تھے۔ علم وفن میں تبحر کے ساتھ فن سپہ گری میں کمال رکھتے تھے[۱]۔ دربار شاہی میں مختلف عہدوں پر مامور ہوئے، فتاویٰ عالمگیری کی تالیف میں بھی ان کی شرکت تھی، اس کے معاوضہ میں دربار شاہی سے تین روپیہ یومیہ ان کو ملتے تھے۔ مآثر عالمگیری میں ہے۔

شیخ رضی الدین بھاگلپوری (بہار) کے شرفا میں تھے۔ یہ فاضل مولفین فتاویٰ عالمگیری میں شامل تھے۔ اور تین روپے یومیہ ان کی تنخواہ مقرر تھی۔ (ص ۶۲)

۱۹۔ مولانا محمد شفیع مولانا محمد شفیع اور ان کے خاندان کے تین اور عالموں کے حالات جو فتاویٰ کی تالیف میں شریک تھے، زیادہ تر سید طٰہٰ صاحب کے مضمون "صوبہ بہار کا ایک قدیم خانوادہ" سے ماخوذ ہیں۔

مولانا محمد شفیع عہد عالمگیری کے بڑے ممتاز اور باصفا عالم تھے۔ عالمگیر کو ان سے بڑی عقیدت تھی، اکثر شہزادگان بھی فیض صحبت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، شجرۃ الاصل للنورانیہ میں ہے[۲]۔

"مولانائے ما اشتہار عام دارند بادشاہ عالمگیر رجوع باد داشت دفرزندان وے بپائے زیارت رسیدہ بودند۔"

(بقیہ حاشیہ) ہیں، لیکن صاحب مشاہیر نے فتاویٰ کی تالیف کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ لکھا ہے "چند نسخہ از تصنیفات شان شہرتے ندارد" (ص ۹۴)

[۱] ترجمہ مآثر عالمگیری (ص ۶۲) [۲] یہ کتاب آج سے ساٹھ سال قبل کی تصنیف ہے اس کا قلمی نسخہ اسی خاندان میں محفوظ ہے۔

آپ دادھیال کی طرف سے عثمانی اور نانہال کی طرف سے سید تھے۔ جدی وطن بغداد تھا۔ ان کے اجداد میں حضرت خواجہ محمد غزنوی بغداد سے ترک وطن کر کے غزنی، وہاں سے سرہند، پھر دہلی، اس کے بعد بہار آگئے۔ اور وہیں بود و باش اختیار کرلی۔ ان کے خاندان کے بعض لوگ اب تک سرہند اور دہلی میں موجود ہیں۔

"ہم از بعضے فرزندان خاندان خواجہ ما خواجہ محمود غزنوی بطریق سیاحت وسفر مخصوص بہ نسبت زیارت حضرت مولوی معنوی محمد شفیع "قدس اللہ بسرہم الفدسی، دریں علاقہ بہار رسیدہ بودند واصل ایشاں از سرہند بود۔ چنانچہ ہم بہ تحقیق پیوستہ حضرت ایشاں از حضرت بغداد و بغزنی نزول فرمودند واز آنجا بسرہند دز آنجا بہ دہلی واز آنجا بحضرت بہار بہار نمودند کہ بعضے از ایشاں ہم در سرہند اقامت دارند و بعضے در دہلی"[1]

سنہ ولادت کی کوئی تصریح تذکروں میں نہیں ملتی، اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کہاں ہوئی۔ البتہ باطنی علوم و معارف کی تکمیل اپنے ماموں حضرت پیر محی الدین قلندری کی خدمت میں کی۔

ان کے متعلق خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ دربار شاہی میں معلم اور اتالیق تھے۔ مگر اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا، آپ کو دربار شاہی کی طرف سے مولوی معنوی کا خطاب ملا تھا۔ چنانچہ ایک فرمان پر یہ عبارت درج ہے۔

بدستور قدیم ممنوعہ درگاہ علائق .... حضرت فضیلت و کمالات دستگاہ مولوی معنوی ملا محمد شفیع سلمہ اللہ تعالیٰ معاف شد۔

سنہ وفات کے متعلق بھی کوئی تصریح نہیں ملتی، خاندان والے ان کے سالانہ

---

[1] شجرۃ الاصل النورانیہ

عرس کی جو رسم ادا کرتے ہیں، اس سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کی تاریخ وفات ۱۱ شوال ہے، ملفوظات گنج رشیدی اور سند شاہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سو سال سے زیادہ عمر پائی، اور ۱۱۰۸ھ تک زندہ رہے۔

" ملا محمد شفیع ساکن التواکہ عمر یک صد و یک سالہ داشتہ اند"

سند شاہی کی عبارت یہ ہے:

رمضان سنہ ۱۶ جلوس (۱۰۸۴ھ) مکرر بعرض رسید۔

آپ کی اولاد میں قاضی بدیع الزمان بڑے پایہ کے عالم تھے۔

جب فتاویٰ کی تالیف کا کام شروع ہوا تو عالمگیر نے مولانا محمد شفیع کی خدمات بھی حاصل کیں، اور ایک روپیہ بارہ آنہ یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا، پھر یومیہ وظیفہ کے بجائے ایک سو تیس بیگھہ اراضی پرگنہ ادگری میں دے دی، جس کی شاہی سند ان کے خاندان میں اب تک محفوظ ہے جس میں ان باتوں کی پوری تفصیل ملتی ہے، عبارت حسب ذیل ہے:

شرح یادداشت واقعہ در سنہ بست و ہشتم شہر رجب سنہ ۱۵ جلوس والا موافق سنہ ۱۰۸۳ھ بہ الاسیادت و ثقافت پناہ شرافت و نجابت دستگاہ سزاوار عنایت پادشاہی قابل مرحمت شاہنشاہی، صدر رفیع القدر رضوی نہال و نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہ خلائق پناہ مرزا بیگ قلمی می گردد کہ بعرض مقدس معلے رسید کہ بموجب فرمان والا شان سعادت نشان مرقوم تاریخ ۱۷ ربیع الاول سنہ ۱۱ جلوس مبارک مبلغ یک روپیہ.... بطریق یومیہ ہر سال ہر دو جنس معاف از خزانہ برکات سعادت بشرط جمع فتاویٰ عالمگیری بہمراہی شیخ وجیہہ الرب مرحوم در وجہ مدد معاش شیخ محمد شفیع ولد شیخ شریف محمد مقرر بود و ثانی الحال در حکم علی العموم یومیہ مذکور

برطرف گشتہ۔ مشار علیہ بحلیہ فضیلت آراستہ است و جمع کثیر وابستہ دارد امیدوار است کہ حکم جہان مطاع، عالم مطیع صادر شد کہ موازی یک صد وسی بیگھہ زمین افتادہ لائق زراعت خارج جمع ازادکری سرکار صوبہ بہار در وجہ مدد معاش او مرحمت فرمودیم واگر در محلے دیگر چیزے داشتہ باشد آں را اعتبار بکنند۔ و یومیہ مذکور را برطرف شمارند واقع ۷ رجمادی الاولیٰ ۱۵ جلوس بموجب تصدیق یاد داشت قلمی شد۔ شرح بہ خط سیادت و نقابت پناہ شرافت و نجابت دستگاہ صدر رفیع القدر رضوی خان گلہ داخل نمایند۔ شرح بخط واقع نویس۔ مطابق واقع است شرح بخط زبدۂ ارباب ارادت، خلاصۂ اصحاب عقیدت، مقرب آنحضرت الخاقانیہ منظور الانظار السلطانیہ، شجاعت و شہامت پناہ جلادت و بسالت دستگاہ شائستہ انواع عنایات.... سزاوار اصناف مراحم پادشاہی بخشی الملک اسد خان گلہ بعرض مکرر رسانید شرح بخط فضائل پناہ کمالات دستگاہ شیخ... رمضان ۱۶ جلوس مکرر بعرض رسید۔ شرح بخط زبدہ وارباب ارادت خلاصۂ اصحاب عقیدت بخشی الملک کلکہ فرمان عالیشان قلمی نمایند۔ از ربیع اوائل شرح ۱۲؍ یومیہ بموجب فرمان عالی شان باسم محمد شفیع بشرط جمع فتاویٰ عالمگیری مقرر بود۔ بعہدہ دریں ولا از پرگنہ اوکری سرکار و صوبہ بہار مرحمت شد۔

۲۰۔ ملا وجیہہ الرب

آپ کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔ فرمان شاہی کی اس عبارت سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ مولانا مغربی کے ساتھ یہ بھی فتاویٰ کی تالیف میں شریک تھے۔ اور دربار کی طرف سے ان کو بھی وظیفہ ملتا تھا۔

"بشرطِ جمع فتاوئ عالمگیری بہمراہی شیخ وجیہہ الرب مرحوم در وجہ مدد معاش شیخ محمد شفیع ولد شیخ شریف محمد مقرر بود۔"

۲۱۔ مولانا محمد فائق مولانا محمد شفیع کے صاحبزادے قاضی بدیع الزمان کے خسر تھے اور فتاویٰ کی جمع و ترتیب میں شریک تھے۔ اس کے عوض میں دربار سے ۸/ یومیہ وظیفہ ملتا تھا۔ پھر بعد میں کچھ زمین جاگیر میں دے دی گئی، جس کی شاہی سند ان کے خاندان میں اب تک محفوظ ہے۔

"شرح یادداشت واقعۂ روز جمعہ ششم شہر ذیقعدہ ۱۶ھ جلوس والا موافق ۱۰۸۴ھ مبلغ دو و نیم روپیہ ۸/ بلا قصور یومیہ ہمراہ ملا محمد اکرم در وجہ مدد معاش سید محمد فائق ولد سید محمد شائق بشرطِ جمع فتاویٰ عالمگیری عوض یومیہ مذکور یک صد و پنجاہ بیگھہ زمین افتادہ لائق زراعت از پرگنہ ایکل سرکار و صوبہ بہار در وجہ مدد معاش او مرحمت فرمودیم"۔

۲۲۔ ملا محمد اکرم مولانا محمد فائق کے ساتھ یہ بھی فتاویٰ کی جمع و ترتیب میں شریک تھے اور ان کو بھی دربار شاہی سے یومیہ وظیفہ ملتا تھا۔

مبلغ دو و نیم روپیہ بلا قصور یومیہ ہمراہ ملا اکرم در وجہ معاش ...... بشرطِ جمع فتاویٰ عالمگیری۔

دارالحکومت کے موروثی مفتی تھے ۱۰۹۰ھ میں اردوئے معلی کے قاضی ملا عبداللہ کے انتقال کے بعد عہدۂ قضا بھی ان کے سپرد ہوا۔ مآثر عالمگیری میں ہے۔

قاضی عبداللہ نے مرض فالج میں دنیا کو خیرباد کہا۔ ان کے بجائے محمد اکرم جو دارالحکومت کے موروثی مفتی تھے۔ اردوئے معلی کی خدمت قضا پر حضور پرنور میں طلب فرما لیے گئے۔ (ص ۲۸۱)

۲۳- ملا فصیح الدین پھلواری

(جامع فتاوے عالمگیری)

از

جناب عون احمد صاحب قادری

دسمبر ۱۹۴۶ء اور جنوری ۱۹۴۷ء کے معارف میں مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب کا مضمون "فتاویٰ عالمگیری اور اس کے مؤلفین" نظر سے گذرا جب تک یہ مضمون ختم نہیں ہوا تھا، خیال تھا کہ پھلواری کے وہ بزرگ جنہوں نے اس کی تدوین میں شرکت کی ہے، ان کا بھی ذکر آئے گا، مگر جنوری کا پرچہ دیکھنے کے بعد معلوم ہوا، کہ صاحب مضمون کو اس کا علم نہیں ہے، کہ پھلواری کے کوئی فاضل بھی اس کی تالیف میں شریک رہے ہیں، اور اگر ان کا علم ہے تو تفصیلی حال معلوم نہیں، اس لیے ذیل کی سطریں برائے اشاعت پیش ہیں۔

ملا فصیح الدین جعفری

ملا فصیح الدین کا وطن بہار کا ایک مردم خیز قصبہ پھلواری تھا، وہ اہل پھلواری کے مورث اعلیٰ حضرت امیر عطاء اللہ جعفری کے پڑپوتے تھے تحصیل علم کے لیے دہلی گئے، اور ملا عوض وجیہہ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر تکمیل کی، سلطان اورنگ زیب عالمگیر کا عہد تھا، استاد دربار شاہی کے ممتاز لوگوں میں تھے۔ ملا فصیح الدین اپنے استاد کے ذریعہ عالمگیر کے دربار میں پہنچے اور اپنے تبحر علمی کی بنا پر فتاویٰ عالمگیری کی

کی تدوین میں شریک کیے گئے، اور سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے ان کی علمی قابلیت اور جوہر ذاتی کی قدر کر کے مدد معاش میں ایک سو ۱۲۰ بیگھہ اراضی اور ایک روپیہ یومیہ خرچ کے لیے عطا فرمایا۔

جب دہلی سے اپنے وطن پھلواری واپس آئے تو اپنے آبائی مدرسہ میں درس دینا شروع کیا۔ ان کے آبائی مدرسہ کا تذکرہ بھی اگلی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ مدرسہ مسجد سنگی سے اتر جانب تھا۔ اس میں حضرت امیر عطاء اللہ کی اولاد سے علما فضلا درس دیا کرتے تھے۔ یہ مدرسہ سنہ ۱۲۷۲ھ تک نہایت عروج کے ساتھ آباد رہا۔

ملا فصیح الدین کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ پھلواری کے متقدمین علماء میں ان کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے، ان کے تلامذہ کی تعداد کثیر تھی۔ ارشد تلامذہ میں موصوف کے چاروں صاحبزادے اور قاضی حیات مرید اور ملا غلام شرف الدین قابلِ ذکر ہیں۔

ملا فصیح الدین کے بڑے لڑکے ملا صبیح الدین انکے بعد مسند درس پر بیٹھے، اور بہت سے لوگوں نے ان سے علمی فیض حاصل کیا۔ ان کے بعد اس مسند پر انکے بھانجے ملا مبین جعفری بیٹھے، جو بیک واسطہ استاذ الکل ملا نظام الدین فرنگی محلی کے شاگرد تھے، ملا مبین کے بعد ملا فصیح الدین کی مسند درس کچھ دنوں خالی رہی، پھر ان کے بھائی ملا مبین کے پوتے مولانا حافظ عبدالغنی اس پر جلوہ افروز ہوئے۔ اور ساٹھ برس تک اس مسند پر درس دیتے رہے۔

ملا فصیح الدین نے سنہ ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اور مسجد سنگی کی شرقی جانب مقبرہ میں مدفون ہوئے، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

ملا فصیح الدین کے صاحبزادے ملا صبیح الدین کے نام سلطان عالمگیر کی طرف سے جو فرمان تھا، اس میں ان کا تذکرہ موجود ہے، فرمان طویل ہے، اس کا وہ حصہ نقل

کرتا ہوں۔

"دریں وقت میمنت اقتران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر شد کہ یک روپیہ یومیہ از خزانہ بلدہ عظیم صوبہ بہار و یکصد و بست بیگھہ زمین از پرگنہ پھلواری مضاف صوبہ بہار در مدد معاش بصلائے تدوین فتاوی بنام ملا شیخ فصیح الدین مقرر بود الحال بمتعلقان ملا مذکور متوفی بلاقید اسامی دیدہ و دانستہ حسب الضمن مقرر شد۔"

یہ فرمان ملا فصیح الدین کے انتقال کے بعد (۱۱۱۹ھ) ۱۵ رجب دوشنبہ ۱۱۲۰ھ میں تجدید کیا گیا تھا۔ ملا فصیح الدین کے نام جو فرمان تھا، اس میں بھی ان کی شرکت کا ذکر تھا، مگر وہ ضائع ہو گیا۔

از جناب مولوی سید شاہ غلام حسنین صاحب ندوی پھلواری

حضرت ملا فصیح الدین جعفری پھلواری کا جامعین فتاوی عالمگیری ہونا یہاں کے خاندانی روایات پر مبنی ہے، اور یہ روایت تحریر میں بھی آئی، تو بہت بعد میں، ان کے ہمعصروں میں سے یا ان کے متصل مولفین میں سے کسی کا نوشتہ موجود نہیں ہے، اس زمانہ کا عام مذاق یہ تھا کہ تذکروں میں بزرگوں کے محض کشف و کرامات کو منضبط کر لینا کافی سمجھتے تھے۔

لیکن پھر بھی اہل علم خاندان میں جو روایت مسلسل چلی آ رہی ہو، وہ بالکل بے اصل اور غیر وقیع نہیں ہو سکتی، اس خاندان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے روایت کے وزن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس خاندان کے مورث خواجہ امیر عطاء اللہ عہد ہمایونی و اکبری میں یہاں آ کر مقیم

ہوئے، خاندانی روایت کے بموجب تو یہ وزرائے شاہی میں تھے۔ لیکن ان کی کوئی اہم حیثیت ضرور تھی۔

ابو الفضل کے اکبر نامہ میں بضمن وقائع ۹۶۱ھ خواجہ عطاء اللہ کا نام بھی ایک جگہ پر مذکور ہے۔ خدا بخش خان صاحب مرحوم کی لائبریری میں شاہان و وزرائے مغلیہ کے ساتھ ایک مرقع امیر عطاء اللہ کا بھی البم کی شکل میں موجود ہے۔ شیر شاہی خاندان کی تباہی کے بعد مغل سلاطین نے رہتاس سے لے کر راج گیر تک پٹنہ کے جنوب میں بہت سے مغل شیوخ اور راجپوت خاندان مختلف مناصب کے ساتھ آباد کر دئے تھے تاکہ پٹھانوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ دیں۔ اسی زمانہ میں خواجہ عطاء اللہ بھی دہلی سے یہاں آئے۔ یہ عبد اللہ بن جعفر طیارؓ کی اولاد سے تھے۔ اسی لیے یہ خاندان جعفری کہلاتا ہے۔ امیر عطاء اللہ نے یہاں سنگ سرخ کی ایک مسجد بنوائی، جو اب تک پھلواری شریف کی جامع مسجد ہے۔ جہاں جمعہ و اعیاد کی سب سے بڑی جماعت ابھی تک ہوتی ہے۔ اور خاکسار راقم الحروف کے زیر تولیت ہے۔ اسی مسجد میں ملا فصیح الدین درس و افتاء کا مشغلہ رکھتے تھے۔ اور اسی سے متصل ان کا مزار بھی ہے۔ چنانچہ شاہ عالم اول فرزند و جانشین عالمگیر نے از روئے فرمان مجریہ ۱۱۲۰ھ ملا فصیح الدین کے لیے وظیفہ مقرر کیا تھا۔ جو از روئے پروانگی و بمہر "اخلاص خاں" ملا صاحب موصوف کے فرزندوں کو ملا تھا، اس کی عبارت مندرجہ ذیل ملاحظہ ہو:

> .... ملا مذکور شاگرد آخوند ملا عوض وجیہہ.... متوطن قصبہ پھلواری سرکار و صوبہ بہار فاضل و متوکل است نیم روپیہ یومیہ و بست بیگھہ[1] زمین مدد معاش از سابق دارد و بخرچ وفا نمی کند امیدوار از تفضلات....

---

[1] معارف: یک روپیہ و یک صد و بست بیگھہ زمین (؟)

ویومیہ مسجد بآں قصبہ بنا کردہ جد مشار الیہ مقرر است نیم روپیہ یومیہ بدستور اصل وبست بیگھہ زمین مزروع مرحمت شد و نیم روپیہ یومیہ مسجد مذکور دیدہ و دانستہ۔

اس فرمان سے ظاہر ہوگیا کہ ملا فصیح الدین شہنشاہ عالمگیر کے ہم عصر تھے، اور فاضل متعارف تھے۔ نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ خاندان کئی پشت سے دربار شاہی سے متعلق تھا۔

پس فتاویٰ عالمگیری کے جمع کرنے میں انہوں نے بھی کچھ خدمت انجام دی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، بلکہ ایسا ہونا بہت ہی قرین قیاس ہے، تاریخ تو بہت سے خاندانی رواجوں، روایتوں اور انفرادی نوشتوں، دفینوں اور سفینوں کو اکٹھا کرکے بنائی جاتی ہے۔ پھر پھلواری کے ذی علم و مقتدر خاندان کی روایت کا ماخذ کیوں نہیں بن سکتی۔

فتاویٰ عالمگیری
کے
دو سندھی مؤلفین اور ان کے اجداد

از مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی مرحوم

دسمبر ۶۶ء اور جنوری ۶۷ء کے معارف میں "فتاویٰ عالمگیری اور اس کے مؤلفین" کے عنوان سے عزیزم مولانا مجیب اللہ ندوی کا جو مضمون شائع ہوا ہے، اس میں سندھ کے بزرگوں سید نظام الدین ٹھٹھوی اور قاضی ابوالخیر ٹھٹھوی کے نام بھی لیے گئے ہیں۔ جن کو فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین میں شمولیت کا شرف حاصل ہے۔

صاحب مضمون نے ان دونوں حضرات کے سلسلے میں تذکرۂ علمائے ہند مصنفہ مولانا رحمان علی کو اپنا ماخذ بنایا جس میں دو سطروں سے زیادہ ان کے سوانح حیات موجود نہیں، ذیل میں ان دونوں بزرگوں کے متعلق مزید معلومات پیش ہیں۔

۱۔ سید نظام الدین ٹھٹھوی

نسب: سید نظام الدین ٹھٹھوی کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔

سید نظام الدین بن سید نور محمد بن سید نظام الدین بن سید نور محمد بن سید شکر اللہ ثانی بن سید ظہیر الدین والاسلام عرف سید جادم اول بن قاضی سید شکر اللہ اول بن سید وجیہ الدین بن سید نعمت اللہ بن سید عرب شاہ بن سید امیر نسیم الدین محمد المعروف بہ میرک شاہ بن امیر عطاء اللہ جمال الدین المحدث بن سید فضل اللہ بن سید میر عبد الرحمٰن

بن سید عبد اللطیف الاسنکی الشیرازی ۔

وطن : ان کے اجداد شیراز میں رہتے تھے ۔ بعد میں ہرات میں رہنے لگے ۔ جہاں سے قاضی سید شکر اللہ اول بن سید وجیہہ الدین ۹۰۶ھ میں قندھار تشریف لائے ۔

سندھ میں آمد : قاضی سید شکر اللہ قندھار میں ۲۱ برس تک رہے ، اس کے بعد مرزا شاہ بیگ ارغون کے ایما سے بسلسلۂ تجارت ۹۲۷ھ میں سندھ میں آئے اور ٹھٹھہ میں سکونت اختیار کرلی ، وہ صاحب علم وفضل ہونے کے ساتھ بڑے متقی اور دیندار تھے ۔ مرزا شاہ بیگ کے بعد جب مرزا شاہ حسن ارغون سریر آرائے سلطنت ہوا ، اس وقت قاضی صاحب کو ٹھٹھہ کی مسند قضا پر فائز کیا گیا ۔

ایک دفعہ شاہ حسن نے چند تاجروں سے کچھ گھوڑے خرید کئے اور قیمت دینے میں جان بوجھ کر اتنا تساہل کیا ، کہ تاجر مایوس ہوکر قاضی سید شکر اللہ کی عدالت میں دعویدار ہوئے ۔ قاضی نے بادشاہ کو بحیثیت مدعا علیہ کے عدالت میں طلب کیا ، اور جب وہ آیا تو اس کو مدعیوں کے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا ، دعوے کی مثل پیش ہوئی ، بادشاہ نے دعوے کی صحت کا اقرار کیا ، اور مدعیوں کو رقم دے کر راضی کرلیا ۔ اس کے بعد قاضی موصوف مسند سے اُٹھے اور آگے بڑھ کر آداب سلطنت بجا لائے ، اور بادشاہ کو اپنی مسند پر لا کر بٹھایا ۔ مرزا شاہ حسن نے اپنے قبا میں چھپائی ہوئی ننگی تلوار نکال کر قاضی صاحب کے سامنے رکھ دی ، اور کہا کہ اگر آج آپ فیصلے سے پہلے آداب سلطنت کو بجا لاتے اور میرے درجے کو ملحوظ رکھ کر مجھے مدعیوں کے ساتھ نہ بٹھلاتے تو اس تلوار سے آپ کا سر قلم کر دیتا ۔ کچھ عرصہ کے بعد سید صاحب نے استعفا دے دیا ۔ اور شاہ حسن نے ٹھٹھہ اوچی کو بلا کر ان کی جگہ مقرر کیا ۔

جن کے متعلق صاحب تحفۃ الکرام لکھتا ہے کہ :

قاضی شیخ محمد اچہ منسوب بآل جعفر از مشاہیر علمائے زمانہ است

تخت از ہرات بہ اچہ رسیدہ بود، در عہد جام نظام الدین چوں سید میراں محمد مہدی جونپوری وارد ٹھٹھہ گردیدہ وعلماء زماں بر و نسبت تکفیر بستند، نام مردہ کہ معنی رسیدہ داشت، و مقامات اہل حال مطلع بود حجت اہل ظاہر را در تکفیر آں دلی اکمل بود، الیق رد نمود، سید میراں بحالش متوجہ گردیدہ دعائے بالش بزرگی و دوام آثار سبزگی باولادش کرد، از انست کہ خاندان آں بزرگ، بوجود حوادث مثنی ہرگز انقلاب زدہ نمی شود، بالجملہ قاضی معزاللہ بعد ہجرت اوچہ وملتان، بٹھہ متوطن گردیدہ، بنا بر کثرت شہرت منسوب باچہ ماندہ وقتیکہ قاضی سید شکراللہ شیرازی استعفاء خدمت قضا ٹھٹھہ، چنانچہ سبق ذکر یافتہ، درخواست داز شاہ حسن حسب تجویز قاضی میر مذکور کہ در وطن قدیم ہرات ہم از اسلاف رابطہ خاص داشتہ و باحیاء آں رابطہ اینجا نیز قرب مقابر وپیوند صورت باب گردید۔ ویرا طلبیدہ بآں منصب جلیل القدر مختص فرمود، بہ برکت قدم تجانبش و دعائے میراں سید مہدی جونپوری آں منصب بتوارث وقف اولادش است در ابتدائے حکومت میرزا عیسیٰ ترخان سجل حیاتش در نور دیدہ شد، دو پسر داالا گہر از مخلف ماندند۔"

اس کے بعد آپ کی اولاد کا تذکرہ ہے۔[1]

اجداد سید شکراللہ نے ٹھٹھہ کے ایک انصاری خاندان میں شادی کی جس سے سید ظہیرالدین پیدا ہوئے۔ سید ظہیرالدین کے متعلق صاحب تحفۃ الکرام رقمطراز ہے کہ:

قائم مقام پدر بزرگوار گردیدہ، فضیلت وحکمت نیک اندوختہ وظاہرش

---

[1] تحفۃ الکرام قلمی ص ۱۱۵

بہ تقوی و تشرع و تدریس و باطن بہ سلوک را فقر و سبیل سنت اجداد مصروف بودہ۔[1]

تاریخ طاہری کا مصنف ان کو اس طرح یاد کرتا ہے:

گوہر بحر عزت و سیادت، درمعدن بلاغت و فصاحت جامع العلوم موشگاف معانی میر ظہیر الدین[2]

آپ کے دو فرزند ہوئے ایک سید شکر اللہ ثانی، دوسرے سید عبدالرحمن، سید شکر اللہ کے متعلق تحفۃ الکرام میں ہے:

با وصف جد و پدر متصف بر آمدہ نامدار روزگار زیست۔

انہوں نے ایک مسجد بھی بطور یادگار اپنے محلہ میں بنوائی، ان کے چار بیٹے ہوئے، سید محمد حسن، سید نور محمد، میر سید ظہیر الدین جادم ثانی، سید لطف اللہ، سید نور محمد جن کے متعلق تحفۃ الکرام میں ہے کہ:

"در وقت خود مظہر اتم علم و عرفان و مرجع اکمل دین و ایقان زیستہ"

ایک فرزند ہوا سید نظام الدین اول جو کہ بقول تحفۃ الکرام:

"درمناظم فضل و کمال اوفق اہل حال و قال گشتہ"

ان کے چار بیٹے ہوئے سید نعمت اللہ، سید محمد نور ثانی، سید فضل اللہ اور سید محمد شفیع۔

سید نظام الدین ثانی

سید نور محمد ثانی کے دو فرزند ہوئے، سید ابوالقاسم اور سید نظام الدین ثانی، یہی سید نظام الدین ثانی فتاوی عالمگیری کے مولفین میں سے ہیں، میر علی شیر قانع، ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"سید نظام الدین ثانی در فقہ اوفق انام درعلوم اعلم کرام بر آمدہ

---

[1] تحفۃ الکرام قلمی ص ۵۴۳ [2] طاہری قلمی ص ۱۱

ونجد بہ طبع گرائیدہ، سوئے جہان آباد شدہ، در فتاوی عالمگیری بسا مشکل کل سائر علماء کردہ از نظر بادشاہ وبگذشت واستدعائے منصب کرد، بادشاہ مطابق ضابطہ کہ اہل فضل را باسم نوکری نخواندندے ازاں آبا فرمودہ تکلیف قبول معاش نمودہ سید رضا نداده عن قریب آنجا سفر آخرت[1] گزید۔"

آپ کی اولاد

ان کے دو فرزند ہوئے، ایک سید عرب شاہ، دوسرے سید احمد، سید عرب شاہ آخری زمانے میں مجذوب ہوگئے اور کوئی اولاد نہیں چھوڑی، سید احمد کے ایک بیٹا سید عطاء اللہ ہوا جس نے شادی کی اور صاحب اولاد بھی ہوا، لیکن عین جوانی میں یہ بھی مجذوب ہوگئے۔

اجداد

ان کے اجداد میں میر نسیم الدین اور عطاء اللہ، جمال الدین، نیز ان کے عم بزرگوار میر اصیل الدین کا تذکرہ قاضی نور اللہ شوستری نے حبیب السیر کے حوالہ سے مجالس المومنین میں کیا ہے۔ نیز روضۃ الصفا اور ا اور ہفت اقلیم وغیرہ میں بھی ان کا تذکرہ آیا ہے، صاحب تحفۃ الکرام نے دوسری جلد میں انہی حوالوں سے ان کے حالات بیان کئے ہیں۔

۱۔ امیر جمال الدین عطاء اللہ بن فضل اللہ المحدث الاسکنی الشیرازی، سید نظام الدین ثانی کے بارہویں جد ہیں، ان کے متعلق تحفۃ الکرام میں مرقوم ہے کہ:

"عم گرامی صرف تتبع وحفظ اقوال وافعال ہدایت مآل نمودہ، فنون عقلیہ را از علوم شرعیہ حلۂ ترتیب وتدوین پوشانیدہ، جواہر دلآلی حدیث مصطفویہ را بانامل تنقیظ در سلک التئام دادا وصحاح حسان سخنان عالمگیرش، تحفۃ الاحبار در ریاض السیر و روضۃ الاحباب است[2]۔"

---

[1] تحفۃ الکرام قلمی ص ۳۴۵ [2] تحفۃ الکرام جلد دوم مطبوعہ بمبئی ص ۱،

حبیب السیر کے حوالہ سے آگے چل کر لکھتا ہے کہ :

"آنحضرت مانند بزرگوار امیر اصیل الدین در علم حدیث بے نظیر آفاق گشتہ ، در سائر علوم دینیہ و یقینیہ از محدثان باستحقاق درگذشتہ ، شاگرد عم خود است ؛ چند سال در مدرسہ شریفیہ سلطانیہ در گنبدے کہ در دو مقبرہ حضرت خاقان منصور است او در خانقاہے خلاصیہ بدرس و افادہ اشتغال داشتہ در ہفتہ یک نوبت در جامع ہرات بموعظہ پرداختے ، سلاطین و حکام خدمتش واجب دانستند[1] "

ہفت اقلیم میں امین رازی لکھتے ہیں کہ :

برادر زادہ سید اصیل الدین عبد اللہ است وے در عصر خود ملاذ طوائف اکابر و اشراف انام بودہ ، لوح ضمیر تنویرش مطرح اشعۂ انوار اسرار کتب الٰہی و صحیفۂ مہر خاطر عالی ، مآثرش بسیط لوامع حقائق اخبار حضرت رسالت پناہے است ۔

زبانش مظہر اسرار تحقیق   ضمیرش منظر انوار توفیق

جمال دین مزین زاہتمامش   علوم شرع واضح از کلامش

از مولفات فصاحت صفاتش روضۃ الاحباب در اقطار آفاق اشتہار دارد[2] ۔

۲۔ امیر نسیم الدین امیر جمال الدین کے بیٹے اور سید نظام الدین کی گیارہویں پشت میں جد تھے ۔ ان کے لیے تحفۃ الکرام میں ہے کہ :

" در تکمیل علوم سیما حدیث یگانہ زمانہ بود ، موجب تعیین سلطان در مقبرہ

---

[1] تحفۃ الکرام جلد دوم ص ۱، [2] ہفت اقلیم مطبوعہ بنگال ص ۲۶۱

مذکور قائم مقام پدر بزرگوار بود، خلف رشیدش سید عرب شاہ بجاے آبا نیک جا گرم کردہ، بعد از دپسرش سید نعمت اللہ یادھاف آیا منصف زیستہ از دو سید وجیہہ الدین یادگار و قائم مقام ماندہ، فرزند رشیدش قاضی سید شکر اللہ کہ در محلہ ثالث میان ٹھٹھہ مذکور گردد[1]

یہی قاضی سید شکر اللہ شیرازی تھے۔ جو ۹۰۶ھ میں ہرات سے قندھار آئے اور ۹۲۷ھ میں قندھار سے سندھ میں تشریف لائے۔

۳۔ میر جمال الدین عطاء اللہ کے عم بزرگوار السید الجلیل امیر اصیل الدین عبداللہ الحسینی الاسکی الشیرازی کے سلسلہ میں تحفۃ الکرام کا مصنف لکھتا ہے:

"در علم تفسیر و حدیث و انشا و تالیف شبیہ و نظیر نداشت، در زمان سلطان ابوسعید از شیراز بہ ہرات تشریف آوردہ ہر ہفتہ یک نوبت در مدرسہ مہد علیا گوہر شاد آغا بموعظہ خلق می پرداخت در ماہ ربیع الاول بر بیان میلاد حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم مواظبت نمودہ۔ از مولفاتش شرح درج الدرر بر سیر سنیہ خیر البشر و رسالہ مزارات ہرات مشہور ہفدہم ربیع الآخر سنہ ثلث و تسعمایہ وفات کردہ، در گوہر نامدار ماند، صفی الدین محمد و برہان الدین محمد[2]"

صاحب موصوف ہی کے متعلق صاحب ہفت اقلیم لکھتے ہیں کہ:

"بصفت اصالت و وفور جلالت موصوف و معروف بودہ، در علم حدیث و تفسیر شبیہ و نظیر نداشتہ، در زمان سلطان ابوسعید از شیراز بہ ہرات تشریف آوردہ و اقامت فرمودہ و باشارۂ آں پادشاہ ہفتہ یک زبان بموعظہ

---

[1] تحفۃ الکرام جلد دوم مطبوعہ بمبئی ص ۱۷۔ [2] تحفۃ الکرام جلد دوم مطبوعہ بمبئی ص ۷۰۔

ونصائح می کشود۔ از مولفاتش کتاب افادت اثر درج الدر کہ محتوی است بر سیر سینۂ خیر البشر و رسالہ مزارات ہرات بین الجمہور مشہور است[1]۔

اس خانوادہ کے اور بھی چند حضرات کا تذکرہ ہفت اقلیم اور تحفۃ الکرام میں آیا ہے، میر اصیل الدین کے ابن عم سید الحکماء المدققین امیر صدر الدین محمد الشیرازی کے متعلق ہفت اقلیم میں آیا ہے کہ:

"بجودت طبع و وقت ذہن از جمیع علمائے متبحرین و فضلائے متاخرین ممتاز و مستثنیٰ بودہ چہ در اندک زمانے از شغل استفادہ فراغت حاصل کردہ آغاز درس و افادہ فرمود، بعد ازاں ہمت بر تالیف و تصنیف گماشت۔ رسالہ تحقیق علم و اثبات واجب، حاشیہ شمسیہ و مطالع و حاشیۂ تجرید را در سلک تحریر کشید۔ وفاتش بعد از فوت سلطان یعقوب در اندک زمانے اتفاق داد[2]۔

صاحب تحفۃ الکرام بھی تقریباً انہی الفاظ میں رقمطراز ہے[3]:

امیر صدر الدین کے فرزند خاتم الحکماء غوث العلماء امیر غیاث الدین منصور شیرازی کے لیے ہفت اقلیم لکھتا ہے کہ:

پرتو آں قمر و ثمر آں شجر است۔ بعد از پدر بہ وفور علم و دانش بر وسادہ فضیلت تکیہ زدہ صیت مہارتش در علوم حکمی و ریاضی بمسامع علمائے نزدیک و دور رسید و صدائے دانشش بہ اطراف و اکناف آفاق افتادہ بین الجمہور مشہور گردید۔

---

[1] ہفت اقلیم مطبوعہ بنگال ص ۲۶۱ [2] ہفت اقلیم مطبوعہ بنگال ص ۲۶۱

[3] تحفۃ الکرام ج ۲ ص ۷۱

وصف خورشید ار نگوید ہوش مند
فیض نور او بود مدحش پسند

چوں فضلاء وے را استاد البشر و عقل حادی عشر خوانده اند ہر آئینہ
تاریخ فوتش را مولانا علی حسن هزاس۔

عقل حادی عشر نمانده بجا یافته[1]

تحفۃ الکرام میں اس سے زیادہ تفصیل ہے۔

ولادتش تسعمایہ در خدمت پدر بزرگوار میر صدر الدین محمد مذکور تحصیل
علوم نموده در چہارده سالگی داعیہ مناظره علامہ دوانی در خود یافتہ رسائل جست
در بیست سالگی از ضبط جمع علوم فارغ گردیده مدتے بر منصب صدارت
پادشاہی مغفور بوئے متعلق بود، در مرتبہ ثانی کہ مجتہد الزمانی شیخ علی بن
عبد العلی از عراق عرب متوجہ پایہ سریر خلافت شده بعضے مفسدان نفار
بمیاں آوردند تا مباحثہ علمی ممہد گردید و بخشونت انجامید پادشاہ حمایت
مجتہد الزمانی کرده ومیر برنجیدند وبعد روزے چند از منصب صدارت
استعفا نموده جانب شیراز شدند۔ در سنہ ثمان واربعین وتسعمایہ فوت یافتہ[2]
تحفۃ الکرام میں حبیب السیر کے حوالے سے ان کی تصنیفات کی ایک طویل فہرست
درج کی گئی ہے۔

صاحب حبیب السیر گفتہ کہ از مصنفاتش انچہ بہ نظر رسید کتاب
حجۃ الکلام ہست در آنجا متوجہ اقاویل حجۃ الاسلام غزالی شده، دیگر
کتاب محکمات میان تحریرین علیین والد خود میر صدر الدین محمد وملا جلال الدین محمد

---

[1] ہفت اقلیم مطبوعہ بنگال ص ۲۵۹۔۔۔۲۶۰ [2] تحفۃ الکرام مطبوعہ بمبئی ص ۷۲

دوانی و حواشی ایشان برشرح تجرید مطالع، دیگر محکمات میان ایشان در حواشی اوائل شرح مختصر اصول عضدی دیگر شرح برکتاب هیاکل انوار دیگر شرح بررسالہ اثبات واجب پدرخود و کتاب تعدیل المیزان برمنطق کہ خلاصہ منطق شفا است یا سوانح طبع نقاد ایشان و کتاب معیار الاذکار خلاصہ تعدیل المیزان و کتاب لوامع و معارج درعلم ہیئت کہ در محاذات کتاب تحفۂ شاہی است و آں را در ہفدہ سالگی تصنیف فرمودہ دیگر کتاب تجرید برحکمت کہ جمیع مسائل حکمت طبیعی و الہئ را بعبارت موجز و مجرد از دلائل ذکر فرمودہ دیگر رسالہ درمعرفت قبلہ دیگر کتاب معالم الشفا در طب، دیگر مختصر آں کہ مسمی بشافیہ است دیگر کتاب سفویہ در ہیئت دیگر حاشیہ برالہیات شفا، دیگر حاشیہ براشارات دیگر حاشیہ برشرح حکمت العین، دیگر رسالہ در باب خلافت فرزند ارجمند میر صدرالدین محمد، دیگر رد بر حاشیۂ شمسیہ علامہ دوانی، دیگر رد بر حاشیہ خلاصۃ التخلیص، دیگر رد برانموذج مشارٌ الیہ، دیگر رسالہ در تحقیق حیات، دیگر رد بر رسالہ زوار مشار الیہ، دیگر رسالہ مشارق در اثبات واجب، کتاب اخلاص منفوری، دیگر حاشیہ براوائل کشاف تفسیر دیگر کتاب مقامات العارفین در تصوف و اخلاق کہ باسم فرزند ارجمند میر شرف الدین علی نوشتہ و رسالۂ قانون السلطنت سوائے آں از تصانیفش انچہ در کتب ایشان بتقریبے اسامی مذکور و بعضے علماء ازاں خبر دادند، کتاب ریاض الرضواں و کتاب اساس درعلم ہندو غیر آں۔

صاحب السیر نوشتہ کہ غرض از تفصیل و تصانیف حضرت امیر و اظہار تشرف بمطالعہ اکثر آں رو کلام بعضے از افاضل عصر است۔ مثل ملا ابوالحسن کاشی

ملا میرزا جان شیرازی کہ مصنفات حضرت میرزا کہ اکثر بواسطہ، نفاست متداول نشدہ بودند۔ بدست ہر کہ می افتاد۔ سخنان خوب را از آنجا می دزدیدند و می گفتند کہ از میرغیر نامے نیست، بعضے کتب کہ در مصنفات متداولہ خود تمام آں را مذکور ساختہ اند۔ وجود خارقی نیافتہ اند۔ اگر احیاناً یکے ازاں کتاب بدست طالب علمے افتاد و بدزدی ایشاں مطلع شد و عوامی نوادر می کنند و از حضرت استاذ تحریر رحمہ اللہ شنیدہ کہ می فرمودند ملا ابوالحسن شش دلیل از جملہ ادلہ کہ در رسالہ اثبات واجب ذکر کردہ، و آں را خواص فکر خود شمردے از شرح ہیاکل حضرت امیر انتحال نمودہ بود و در دیباچے کہ بالتماس بعض اعزۂ وے رسالہ او می نوشتم اظہار سرقہ و انتحال او نمودم، آں رسالہ متروک ساختہ، رسالۂ دیگر تالیف نمود، آں نیز خالی از سرقہ نیست از اثر مہارت میر در فنون ادعیہ و طلسمات قتل، ذوالفقار خاں حاکم بغداد است کہ با بادشاہ دین پناہ می درزید و تفصیل آں بر السنہ جمہور مذکور و مجملے ازاں در رسالہ قانون السلطنت مسطور[1]

ان کے دو فرزند ہوئے ایک سید شریف الدین، دوسرے میر صدر الدین، اس خانوادہ کے دو اور بزرگوں کا بھی تحفۃ الکرام میں ذکر آیا ہے۔ یعنی میر نظام الدین اور میر حبیب اللہ، یہ دونوں حضرات بھی علم و فضل کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے۔

سادات شکر اللہ | قاضی سید شکر اللہ کی نسبت سے میر نظام الدین کا خاندان ٹھٹھہ میں سادات شکر اللاہی شیرازی کے نام سے موسوم

---

[1] تحفۃ الکرام مطبوعہ بمبئی ص ۲، ۷۔ ۳۔

ہُوا، اسی خانوادہ کے تقریباً تمام افرادِ علم و فضل، نیز دینی مرتبے کی وجہ سے یگانۂ روزگار ہوتے آئے ہیں - آج بھی ان کا خاندان اپنے قدیم محلہ میں آباد ہے -

اس موقع پر میں خاندان کے چند بزرگوں کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں، تاکہ اندازہ ہو جائے کہ اس خاندان کے مختلف افراد نے سندھ میں آنے کے بعد علم، ادب اور مذہب کی کیا کیا خدمتیں انجام دیں -

سید شاہ ولی سید شاہ ولی بن سید ابو القاسم بن سید علی اکبر بن سید عبد الواسع بن سید محمد حسین بن سید شکر اللہ ثانی، علامۂ مخدوم رحمہ اللہ جیسے یگانۂ روزگار کے شاگرد تھے - اور بقول صاحب تحفۃ الکرام :

در املا و انشا و شعر طبیعت صافی و قریحت کافی داشتہ[1]

صاحب تحفۃ الکرام میر علی قانع مقالات الشعراء میں آپ کا ذکر یوں فرماتے ہیں :

بفنون کمالات علمی آراستہ و حلہ تورع و تقوی پیراستہ اوقات بابرکاتش صرف مطالعہ کتب و افادہ تلامذہ می بودہ، بر جادہ اسلاف مستقیم و میان سادات بہ بزرگی موصوف و بحسن خلق و فرط متانت نزد اکابر و اصاغر معروف[2]

صاحب موصوف نے تحفۃ المجالس کے نام سے ایک تصنیف بھی چھوڑی ہے ، شوال المکرم ۹۵۰ھ کی ۱۳ تاریخ کو رات کے وقت اپنی جاگیر جگت پور تعلقہ اکرانہ (سندھ) میں وفات پائی - نعش وہاں سے لاکر ۱۵ تاریخ کو ان کے آبائی قبرستان میں دفن کی گئی - ان کے ایک شاگرد لطف اللہ نے "قد فات فی عشقہ" سے تاریخ وفات نکالی ہے - مقالات الشعراء میں ان کے دو فارسی شعر بھی نمونہ کے طور پر دئے گئے ہیں، تذکرہ علمائے ہند میں بھی صفحہ ۲۵۰ پر ان کا ذکر آیا ہے ان کے دو فرزند ہوئے، ایک سید محمد ناصر، دوسرے سید محمد سراج -

---

[1] تحفۃ الکرام جلد ۳ ص ۶۵ مطبوعہ بمبئی [2] مقالات الشعراء قلمی ص ۳۰۴

میر سراج الدین میر سراج الدین بھی بہت اچھے شاعر ہوئے ہیں، تاریخ گوئی میں ان کو خاص دستگاہ حاصل تھی، تحفۃ الکرام میں درج ہے کہ:

بادصاف اسلافش متصف جانشین و یادگار بزرگان است بہ محامد اخلاق موصوف مشار الیہ سائر اولاد جدی باشد، طبیعت شعر دارد و در استخراج تواریخ نیکو مہارت می نماید[1]

سید غلام اولیاء سید غلام اولیاء بن سید اسد اللہ بن سید عنایت اللہ بن سید عبد الرحمٰن بن سید ظہیر الدین والاسلام عرف میر جادم بن سید شکر اللہ اول بہت بڑے بزرگ اور اہل دل گذرے ہیں، ان کے متعلق تحفۃ الکرام کا مصنف لکھتا ہے کہ:

در عین جوانی بہ تحصیل علوم ظاہر و باطن متوجہ شدہ و بہ اتقاء و تورع درجۂ علیا فرا اندوختہ... صاحب خوارق کلیہ برآمدہ مجرد و در عین رشد جہان فانی را پدرود کردہ، جماعۂ مخصوصہ ارادت مند ماند، بہ بست و یکم ہر ماہ مطابق روز وفاتش مجمع ارادت مند بزیارتش و ختم و اطعام بعمل آوردند و کشف مہمات می نمایند[2]

سید محمد ناصر سید محمد ناصر بن سید عطاء اللہ بن سید نعمت اللہ، بن سید نظام الدین بن سید نور محمد بن سید شکر اللہ ثانی بن سید ظہیر الدین بن سید قاضی شکر اللہ اول زہد و تقویٰ میں "اعجوبۂ روزگار" تھے۔ تحفۃ الکرام میں ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی عورت کا منہ نہیں دیکھا۔ اس حد تک معصوم تھے کہ جانوروں میں بھی نر و مادہ کی تمیز نہ تھی سلسلۂ نقشبندیہ میں وہ کامل تھے۔ اور عقیدت مندوں کی بہت کثرت

---

[1] تحفۃ الکرام مطبوعہ بمبئی جلد ۳ ص ۱۹۶ [2] تحفۃ الکرام جلد سوم ص ۱۹۶ مطبوعہ بمبئی

تھی، جن کی حاجت روائی فرماتے رہتے تھے۔

ایک دفعہ ٹھٹھہ میں خشک سالی ہوئی، لوگ بہت پریشان ہوئے، مزارات اور مقابر پر جاکر دعائیں مانگنے لگے۔ کسی شخص کو خواب میں بشارت ہوئی کہ جس شخص نے کبھی عورت کا منہ نہ دیکھا ہو اسے نماز استسقاء پڑھانی چاہیئے۔ تاکہ بارانِ رحمت کا نزول ہو۔ لوگ ان کے پاس آئے۔ والدۂ محترمہ کے ارشاد سے انہوں نے تین دن تک نماز پڑھائی اور دعائیں مانگیں۔ تا آنکہ ابرِ رحمت جوش میں آیا اور گوہرِ مقصود حاصل ہوا۔

سید نظام الدین کے جد دوم یعنی سید نور محمد کے دوسرے بھائی سید ظہیر الدین جادم ثانی کی اولاد میں بھی بہت سے اہلِ کمال پیدا ہوئے۔

سید محمد کاظم سید محمد کاظم بن سید محمد مقیم بن سید ظہیر الدین ثانی کے متعلق تحفۃ الکرام میں ہے کہ:

عجائب احوالات داشتہ، احیاناً دو دو، سہ سہ، روز و شب در خواب کہ عین بیداری تواں انگاشت، بخلوت بودے، و ذکر قلبی از مردم مسموع کردے آخر باخود یا فاقہ رسیدے ہم چنیں کمالات دیگر داشت از احصا افزوں باشد[1]۔

صاحب تحفۃ الکرام میر سید علی شیر بن سید عزت اللہ بن سید محمد کاظم بن سید محمد مقیم بن سید ظہیر الدین بھی اسی سلسلہ عالیہ کے ایک جوہرِ تابندہ اور گوہرِ درخشندہ تھے۔ تحفۃ الکرام، مقالات الشعراء اور کئی تصانیف انہوں نے یادگار چھوڑی ہیں، اگر وہ تحفۃ الکرام اور مقالات الشعراء نہ لکھتے، تو آج سندھ کی سیاسی اور ادبی تاریخ سے ہم قطعی نابلد رہتے۔

---

[1] تحفۃ الکرام قلمی ص ۵۵۶

میر عظیم الدین اس خانوادے کی ایک اور عظیم شخصیت میر عظیم الدین نام کی ہے، جس کا سلسلہ یوں ہے، سید عظیم الدین بن سید یار محمد بن سید عزت اللہ بن سید محمد کاظم بن سید محمد مقیم بن سید ظہیر الدین ثانی، یہ بھی ایک بلند پایہ شاعر و ادیب تھے۔ ایک دیوان، ایک مثنوی، میر رانجھا اور ایک منظوم تاریخ موسوم بہ فتح نامہ ان کی یادگار ہیں۔

غرض سید نظام الدین مؤلف فتاویٰ عالمگیری کا تمام خاندان شیراز اور قندھار سے لے کر سندھ تک کئی صدی برابر علم و فضل کے دریا بہاتا اور دین کی بیش بہا خدمات انجام دیتا رہا۔

۲۔ قاضی ابوالخیر ٹھٹوی

سید نظام الدین کے بعد فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین میں قاضی ابوالخیر ٹھٹوی کا نام آتا ہے۔ یہ بزرگ بھی سندھ کے مشہور مردم خیز اور تاریخی شہر ٹھٹھہ کے باشندے تھے۔

یہ ٹھٹھہ کے مشہور عالم اور بزرگ علامہ مخدوم فضل اللہ کے فرزند تھے، جن کے متعلق تحفۃ الکرام میں ہے کہ:

جامع فضائل قدسیہ عادی معارف الٰہیہ، محلی زیور ورع و تقویٰ بودہ
ہموارہ بدرس علامہ اشتغال در زیدے[1]

تاریخ معصومی[2] اور مآثر رحیمی[3] میں بھی تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ اس طرح ان کی تعریف کی گئی ہے۔ وہ مرزا عیسیٰ اور میرزا باقی ترخان کے معاصر تھے، ان کے فرزند مخدوم ابوالخیر کیلئے تحفۃ الکرام کا مصنف بیان کرتا ہے کہ:

---

[1] تحفۃ الکرام قلمی ص ۶۲۰ [2] معصومی ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتہ ص ۲۱۷
[3] مآثر رحیمی ص ۳۳۸ بنگال

در زمانہ خویش طالب علم کامل بر آمدہ، در فتاویٰ عالمگیری شریک
استنباط مسائل شد[1]

ان کے ایک فرزند ہوا ملا اسحٰق جو خود بھی بطور تحفۃ الکرام جامع کمالات تھا، ان کے ایک بیٹا کمال الدین ہوا جس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

---

[1] تحفۃ الکرام ص ۶۲۰

قاضی سید عنایت اللہ مونگیری

مؤلف فتاویٰ عالمگیری

از

مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی ورنا کلرسوسائٹی احمد آباد

عرصہ سے تین چیزوں کے متعلق معلومات فراہم کر رہا تھا، اول عالمگیر کے مخطوطات قرآنیہ، یعنی عالمگیر کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن اس وقت کہاں کہاں ہیں، دوم عالمگیر کے استاد کون کون تھے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ تدوین فتاویٰ عالمگیری میں کون کون لوگ شریک تھے۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ برادرم مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی نے موخر الذکر عنوان پر قلم اٹھایا، انہوں نے سولہ اشخاص کے نام پیش کئے ہیں، اور ایک نام کا اضافہ پھلواری کے ایک صاحب قلم نے کیا ہے۔

راقم الحروف نے جن اشخاص کے نام جمع کیے تھے، ان میں سے اکثر تو معارف میں آ گئے، لیکن کچھ نام باقی رہ گئے ہیں، جن کے متعلق ابھی تحقیق باقی ہے۔

۱۔ امیر میران علامہ ابوالفرح معروف بہ سید معدن (حیات جلیل بلگرامی ص ۱۲) صدن ضلع فرخ آباد میں مدفون ہیں ۔

۲۔ شاہ عبدالرحیم صاحب جو مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے والد ماجد ہیں، گو وہ اس مجلس میں زیادہ دن شریک نہ رہے۔

۳۔ ملا جمیل جونپوری (تذکرہ علمائے جونپور ص ۸۸)

۴۔ ملا غلام محمد قاضی القضاۃ لاہوری جو ملا حبیب استاد شاہزادہ عظیم الشان بن بہادر شاہ بن عالمگیر کے بھانجے تھے ۔ شہر گھاٹی[۱] کے باشندے ہیں (آثار شرف قلمی ص ۱۸ بحوالہ ندیم گیا جولائی ۱۹۴۴ء)

۵۔ قاضی سید عنایت اللہ مونگیری (ہندوستان کے مدارس اسلامی ص ۵۱) ان میں سے موخر الذکر بزرگ جناب قاضی عنایت اللہ صاحب مونگیری کے کچھ حالات فراہم ہوئے ہیں، وہ ذیل میں پیش ہیں، جناب قاضی صاحب کا نسب نامہ ذیل میں پیش ہے۔

قاضی صاحب کا نسب نامہ قاضی سید عنایت اللہ بن قاضی سید عبدالنبی بن سید عبدالسلام بن سید شاہ جمال الدین بن سید شاہ احمد جاجنیری بانی خاندان بارہ گانوں وسورج گڑھا۔

سید عنایت اللہ صاحب خاص سورج گڑھا محلہ چک مسکن ضلع مونگیر میں پیدا

---

[۱] شہر گھاٹی ضلع گیا سے جنوب کی طرف ۲۰ میل کے فاصلہ پر ایک مردم خیز خطہ ہے۔

ہوئے تقریباً ۱۰۵۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی، ابتدائی کتابیں اسی جگہ پڑھیں، ان کے والد ماجد قصبۂ سورج گڑھا اور رکجرہ کے قاضی تھے۔ اور گو برائے نام سہی، مگر اس وقت تک اس خاندان میں قضائت چلی آتی ہے، غرض اس عہد کے دستور کے مطابق متوسط درجہ کی تعلیم حاصل کر کے وہ دہلی پہنچے، شام کا وقت تھا، ایک شخص کے مکان پر شب باشی کی اجازت مانگی۔ اس نے ان کا حال سن کر اجازت دے دی اور کھانا بھی کھلایا، رات جب زیادہ ہوئی تو مالک مکان چراغ گل کر کے اندر جانے لگا، سید صاحب نے کہا کہ مجھے کچھ قرآن پڑھنا ہے، میں سوتے وقت چراغ گل کر دوں گا۔ وہ اندر چلا گیا، اور سید صاحب دیر تک قرآن پڑھتے رہے، یہاں تک کہ کوتوال شہر گشت کرتے ہوئے ادھر آنکلا، چونکہ سید صاحب بہت ہی خوش الحان تھے، اس لیے وہ دیر تک کھڑا ان کا قرآن کا پڑھنا سنتا رہا، پھر سامنے آکر اس نے تمام حالات سے آگاہی حاصل کی، صبح کو اس کوتوال نے ان کو طلب کر کے مزید تحقیق کی، اور جب اس کو ان کے علمی ذوق کا یقین آگیا، تو اپنی سفارش سے شاہی مدرسہ میں داخل کرادیا۔

اس مدرسہ میں کب تک تعلیم پاتے رہے یہ معلوم نہیں، لیکن اختتام تعلیم کے بعد ان کی علمی استعداد کی بنا پر اسی مدرسہ میں معلم کے عہدہ پر ان کو مامور کیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب ان کے علم و فضل کا چرچا پھیلا، تو ان کو فتاویٰ عالمگیری کے مولفین میں شامل کر لیا گیا۔ اور غالباً آخر تک (۱۰۸۶ھ) اس کام کو سرانجام دیتے رہے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ پھر شاہی مدرسہ کے مدرس ہو گئے، اور ۱۰۹۹ھ تک اس پر مامور رہے۔

اس دوران ان کے والد سید عبدالنبی صاحب کا جو سورج گڑھا اور رکجرا کے قاضی تھے، انتقال ہو گیا۔ اور کچھ عرصہ تک یہ جگہ خالی رہی، پھر شرفائے سورج گڑھا کی درخواست پر سید عنایت اللہ صاحب کو ان کے والد بزرگوار کی جگہ پر قاضی بنا کر بھیج دیا گیا۔ اور محکمۂ قضائت کی سند عطا کرتے وقت شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر نے اپنے

ہاتھ سے لکھی ہوئی دو عدد حمائل (قرآن مجید) قاضی صاحب کو عنایت فرمائی، جس کے اوراق نامساعدت زمانہ سے منتشر ہو گئے۔

قاضی صاحب اپنی وفات تک اس عہدہ پر فائز رہے، اور سورج گڑھا چک مسکن ہی میں وفات پائی، جہاں ان کا پختہ مزار آج تک موجود ہے۔ عہدۂ قضا پر سرفراز کرتے وقت جو فرمان قاضی صاحب کو عنایت ہوا وہ آج تک محفوظ ہے[1]۔ فرمان کی عبارت حسب ذیل ہے:-

دریں وقت فرمان والاشان صادر شد کہ خدمت قضا پرگنہ سورج گڑھا و کجری تابع سرکار مونگیر متعلق صوبہ بہار از انتقال عبدالنبی بہ سید عنایت اللہ پسرش و موازی چہل بیگھہ زمین افتادہ لائق زراعت خارج جمع از پرگنہ سنگھون تابع سرکار مذکور بشرط خدمت و عدم اخذ مہرانہ و نکاحانہ در وجہ مدد معاش او حسب الضمن مقرر باشد کہ بلوازم و مراسم آں کماینبغی پرداز د و در نشر شرعیات و قطع و فصل قضایا معاملات و رفع و دفع دعاوی و خصومات و قسمت ترکات و کتابت

مسکوک و سجلات و تحریص و ترغیب مردم بہ طاعات و عبادات و اجرائے حدود و تعزیرات و اقامۂ جمعہ و جماعات و تحقیق اموال غیب و ایتام و تعین اوصیاء و نصب مقرر نمودن، نائب متدین طالب علم مساعی موفورہ بتقدیم رساند باید کہ حکام و عمال و جاگیرداران و کروریاں حال و استقبال اورا قاضی آں محلات دانند و زمین مذکور را پیمودہ و چک بستہ بہ تصرف او باز گذارند و اصلاً و مطلقاً تغیر و تبدیل بداں راہ نہ دہند و علت

---

[1] کتاب الحیات بعد الممات دہلی

مال وجہات اخراجات مثل قلعہ وپیشکش وجریبانہ وضابطانہ ومحصلانہ ومہرانہ دارد و
عہگانہ وبیگار وشکار ومقدمے وقانون گوئی وضبط رسالہ بعد از تشخیص چک وتحسیر
زراعت وکل تکالیف دیوانی ومطالبات سلطانی مزاحم نشوند، ودریں باب ہر سال
سند مجددہ نطلبند واگر در محلے دیگر چیزے دانستہ باشند آن را اعتبار نہ کنند،
طریق جمہور سکنہ ومتوطنین پرگنات مسطور انکہ خطوط وقبالات وصکوک وسجلات
را بخط ومہر او شمرند غرۂ شعبان سال سی ویکم جلوس ۳۱ سنہ شرح یادداشت واقعۂ تاریخ
روز چہارشنبہ بست وششم شہر جمادی الآخر ۱۳ سنہ جلوس والاموافق ۱۰۹۹ سنہ مطابق ہشتم
اردی بہشت مارسالہ صدارت ومشیخت پناہ فضیلت وکمالات دستگاہ وسزاوار
مرحمت واحسان صدر منبع القدر "فاضل خان" ولوبت واقعہ نگاری کمترین بندہ درگاہ خلائق
آرام گاہ "محمد ساقی" قلمی می گردد، سید عنایت اللہ ولد سید عبدالنبی از نظر اقدس اعلی
گذشت وبعرض مقدس معلی رسید پروانگی بہ مہر ودستخط مشیخت وفضیلت پناہ فضائل
خان رسیدہ کہ بموجب التماس محمد شفیع وغیرہ سکنہ پرگنہ سورج گڑھ وپرگنہ کجرہ سرکار
مونگیر صوبہ بہار بعرض والا رسید۔ کہ از مدتے عبدالنبی قاضی پرگنات مسطور فوت شدہ
وبدون قاضی معاملات شرعیہ فیصل نمی یابد والا شرف نفاذ یافت کہ بندہ بر تقدیر
وقوع قاضی دیگر، بعرض مقدس رسانیدہ مقرر نمایند، حقیقت بریں منوال است کہ در
پرگنہ سورج گڑھ وپرگنہ کجرہ سرکار مونگیر مذکور قاضی از حضور پر نور تعین نہ شدہ ومحضر
بہ مہر مردم رسید کہ سید عبدالنبی خاص موروثی پرگنات مسطورہ روبعین حیات سپرد
وسید عنایت اللہ پسرش متوفی بحضور پر نور رسیدہ طالب علم است برچہ فرمان شود۔
حکم جہاں مطاع، عالم مطیع صادر شد کہ خدمت قضا پرگنات مرقوم مع سواد
قصبات وقریات متعلقہ آں از انتقال سید عبدالنبی متوفی مشار الیہ وموازی چہل بگھہ
زمین افتادہ لائق زراعت خارج جمع پرگنہ سنگبول سرکار مونگیر مذکور، مادامیکہ قاضی
باشد بشرط عدم اخذ مہرانہ ونکاحانہ در وجہ مدد معاش او مرحمت فرمودیم

ونیز حکم شد درجائے کہ خود نہ رسد نائب مندین طالب علم تعیین می
کردہ باشد واگر در محال دیگر چیزے دانستہ باشند آن را اعتبار نہ
کنند واقعہ ۸ / رجادی الآخرہ سنہ ۳۱ ۔

اس کے بعد مدار المہام جملۃ الملک اسد خاں وزیر اور فاضل خاں صدر الصدور کی دستخط اور تصدیق ہے ۔ اس فرمان سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ سند پاتے وقت وہ دہلی میں عالمگیر کی ذات سے متعلق کسی محکمہ میں تھے ۔ عام طور پر مشہور ہے کہ مونگیر کے ایک عالم بھی فتاویٰ عالمگیری کی تدوین میں شریک تھے ۔

(دیکھو ہندوستان کے مدارس اسلامی ص ۵۱)

لیکن سورج گڑھ میں خاندانی روایات کی بنا پر بوثوق کہا جا سکتا ہے ، کہ محکمۂ قضائت میں آنے سے قبل وہ اس مجلس تدوین کے رکن تھے ۔ مرأۃ العالم میں ہے کہ اس مجلس کے صدر ملا نظام الدین تھے ، اور ان کے ماتحت چار اور عالم تھے ۔

۱۔ قاضی محمد حسین جونپوری محتسب عسکر

۲۔ سید علی اکبر سعد اللہ خانی

۳۔ ملا شیخ محمد حامد جونپوری ، تلمیذ میر زاہد کابلی

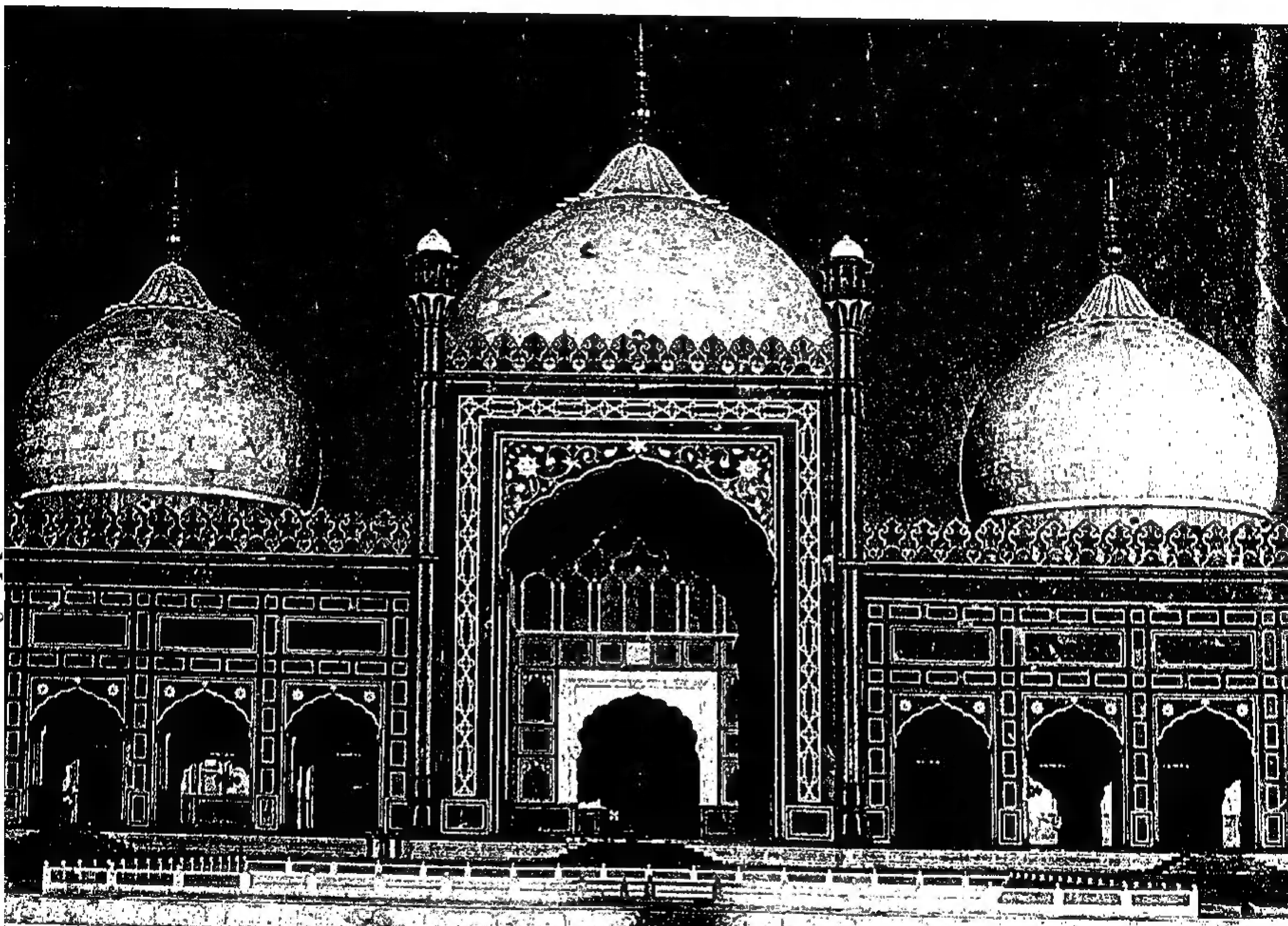
۴۔ ملا محمد اکرام اللہ معلم شاہزادہ محمد کام بخش

ان میں سے ہر ایک کے سپرد ایک ربع تھا ۔ معلوم نہیں قاضی صاحب ان میں سے کس کے ماتحت کام انجام دیتے تھے ۔

(بحوالہ تاریخ برہان پور)

مکرمی سید وجاہت حسین ساکن سورج گڑھا چک مسکن ضلع مونگیر فرماتے تھے کہ ایک دوسری دستاویز بھی خاندان میں موجود ہے ، جس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ قاضی صاحب مدونین فتاویٰ میں شریک تھے ، لیکن افسوس ہے کہ تلاش کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی ، اور اس کے بعد ہی موصوف کا انتقال ہو گیا ۔

فتاویٰ عالمگیری کے مؤلفین



تالیف

مولانا مجیب اللہ ندوی

مرکزِ تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری
نسبت روڈ ○ لاہور